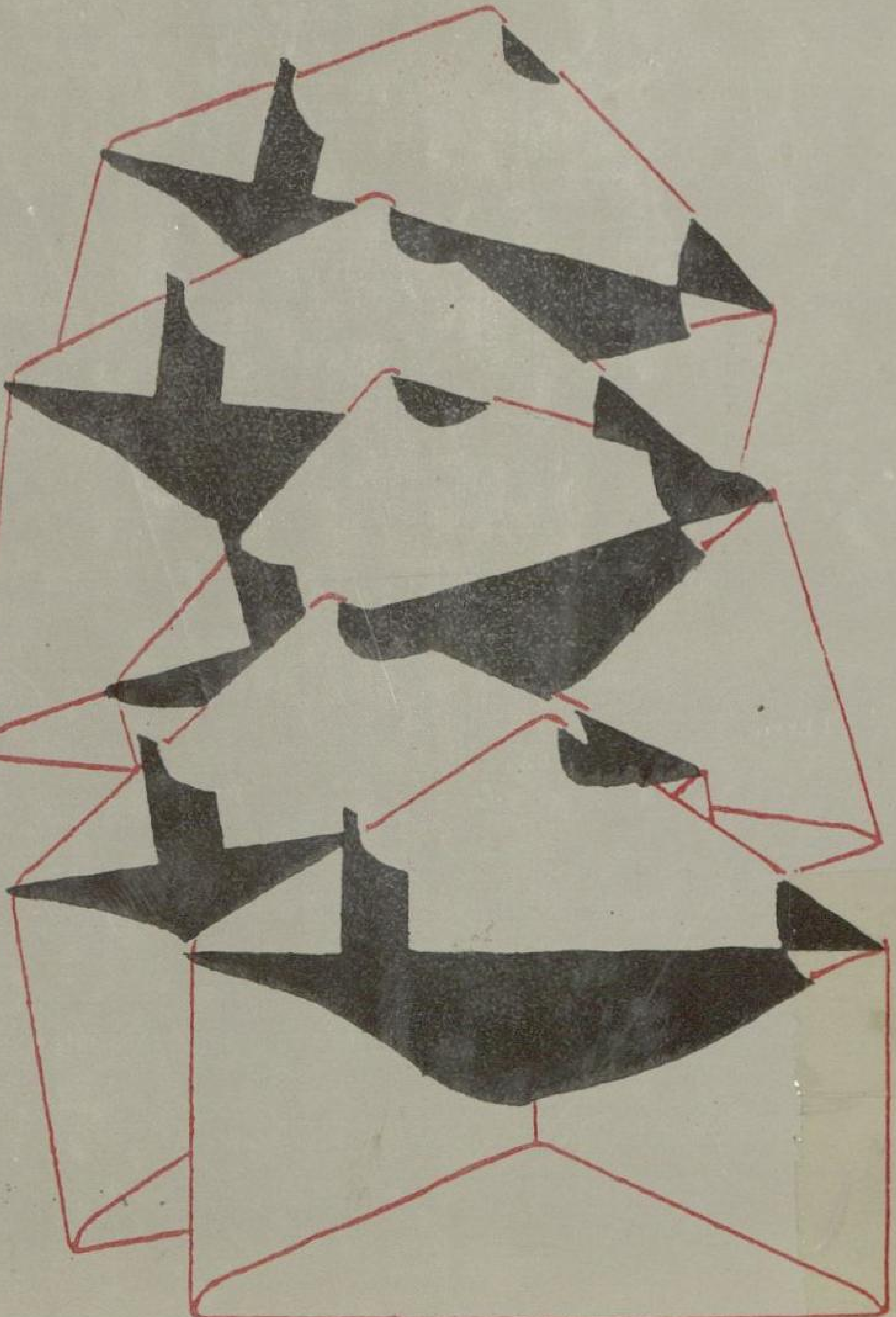
محبت نامے

امرتا پریتم



محبّت نامے

امرتا پریتم کے خطوط امروز اور دیگر اہلِ قلم کے نام

امرتا پریتم کی دیگر کتب

۱- میرا کمرہ
۲- رسیدی ٹکٹ

مُحبّت نامے

امرتا پریتم

مکتبہ اُردو ادب
بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ لاہور

ناشر ـــــــ سرفراز احمد
مطبع ـــــــ منظور پریس لاہور
قیمت ـــــــ ۳/- روپے

حرفِ آغاز

امرتا پریتم —— پنجابی کی ممتاز شاعر، ادیب اور صحافی

امرتا کے ذکر میں (باوجود تقاضائے قواعدِ زبان) مجھے جنسی امتیاز میں تامّل ہے بمعترض کے جواب میں کہہ سکتا ہوں کہ نفسیات، تعلیم، طب، قانون وغیرہ سنجیدہ موضوعات پر جو تحریریں مطالعہ میں آتی ہیں، اُن میں موضوع الیہ کا ذکر صیغۂ مذکر ہی میں ملتا ہے، گو مفہوم ہر دو اجناس سے ہوتا ہے اور پھر ہمارے پنجابی روزمرّہ میں اناثِ خانہ کو بھی عموماً صیغہ مذکر ہی سے مخاطب کیا جاتا ہے۔

امرتا بنیادی حیثیت سے ایک شاعر ہے۔ اُس کا نام ذہن میں آتے ہی تصوّر تاریخِ ادب کے اوراق پر آوارگی اختیار کر لیتا ہے۔ یکے بعد دیگرے مختلف زبانوں کی شاعرات ذہن میں گھومنے لگتی ہیں۔ اوّلاً یونانِ قدیم کی مشہور شاعرہ سیفو (پیدائش ۶۱۵ ق م) کا خیال آتا ہے، جس نے اپنے آبائی جزیرہ لیزبو میں شعر و سخن میں سرشار کئی دوشیزاؤں کا ایک حلقہ اپنے گرد جمع کر لیا تھا اور اُن کی محبت میں عشقیہ نغمات لکھا کرتی تھی۔ ایک نویلی دلہن کے بارے میں اُس نے ایک نظم لکھی، جس میں دُلہن کا ذکر اس طرح ہے

اُس شیریں سیب کی مانند، جو درخت کی بلند ترین شاخ پہ بتدریج سُرخی اختیار کرتا ہے۔

بُلند، بُلند ترین شاخ پہ

جس کی جانب ہاتھ بڑھانا شاید سبھی سیب اتارنے والے بھول گئے تھے۔
یا شاید بھولے نہ تھے، بلکہ اسے حاصل نہ کر پائے تھے
اور آج تک کوئی بھی اس پہ قابض نہ ہو سکا تھا....

اور پھر دلہن کو مخاطب کر کے دلہا کے بارے میں اُس نے لکھا:

لافانی دیوتاؤں کی طرح مبارک ہے وہ نوجوان، جو نشۂ محبت میں سرشار تمہارے پہلو میں بیٹھا ہے۔

وہ مسلسل تمہاری جانب تک رہا ہے، تمہاری باتیں سن رہا ہے پھر نہایت نرم لہجہ میں کچھ کہتا ہے اور مسکرا دیتا ہے......

......اور پھر تاریخِ اسلام کا ایک واقعہ یاد آتا ہے، جسے مولانا جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی تصنیف تاریخ الخلفا میں درج کیا ہے۔ ایک رات حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے معمول کے مطابق مدینہ کی گلیوں میں گشت کر رہے تھے۔ وہ ایک مکان کے سامنے رک گئے۔ دروازہ پہ پڑے پردوں کے پیچھے چراغ روشن تھے اور کوئی عورت نہایت شیریں، مگر دردناک لہجہ میں گا رہی تھی ؎

تطاول هذا الليل واز ور جانبه ولیس الی جنبی خلیل الاعبه[1]

اور اس طرح کے دو اور اشعار پڑھنے کے بعد اُس نے یہ شعر پڑھا

فو الله لو لا الله تخشٰی عواقبه لزعزع من هذا السریر جوانبه[2]

حضرت عمرؓ نے دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کہ اُس کا شوہر جنگ پہ گیا تھا اور یہ اُس کی

---

[1] کم بخت رات کاٹے نہیں کٹتی اور تارے گشت کر رہے ہیں۔ حیران ہوں، اس وقت کوئی میرا ہم بستر نہیں ہے، جس سے خوش فعلی کر سکوں۔

[2] خدا کی قسم! اگر انجام میں خوفِ خدا نہ ہوتا تو اس وقت اس چارپائی کی چولیں ہلتی نظر آتیں۔

جدائی میں شعر خوانی کر رہی تھی۔ فوراً حکم جاری ہوا کہ جنگ پر گئے سپاہیوں کو ہر چار ماہ کے بعد لازمی رخصت دی جایا کرے.....

...... پھر تصور ایران جدید کی تین شاعرات کی جانب بڑھتا ہے۔ فروغ فرخ زاد (پیدائش ۱۹۳۴) نے جب اپنی نظموں میں جذباتِ نسوانی کا بے باکانہ اور بے تکلف اظہار کرنا شروع کیا تو کچھ ثقہ قسم کے لوگوں نے طوفان اٹھالیا۔ اس پر شاعرہ نے کہا:

"اگر مرد اس قسم کی شاعری کرتا ہے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا اور جب عورت اپنی روح کا عکس پیش کرنا چاہتی ہے تو کہرام سا مچ جاتا ہے اور لوگ اخلاق و عفت کی تباہی کا ماتم کرنے لگ جاتے ہیں[1]۔"

فرخ زاد کی ایک نظم کا آخری بند یاد آتا ہے ؎

آہ! اگر باز بسویم آئی   دیگرم از کف ندہم آسانت
ترسم این شعلۂ سوزندۂ عشق   آخر آتش فگند بر جانت[2]

پھر ایک اور نظم میں کہتی سنائی دیتی ہے ؎

بیا اے مرد! اے موجودِ خودخواہ   بیا، بگشای درہای قفس را
اگر عمری بزندانم کشیدی   رہا کن دیگرم این یک نفس را[3]

---

[1] بحوالہ "جدید فارسی شاعری، مؤلفہ ڈاکٹر منیب الرحمٰن (علیگڑھ: ۱۹۵۹ء)

[2] آہ! اگر تو ایک بار پھر میرے پاس آجائے تو تجھے آسانی سے نہ چھوڑوں۔ مگر مجھے ڈر ہے کہیں عشق کا یہ شعلۂ سوزندہ تمہاری روح کو جلا نہ ڈالے۔

[3] اے خود پرست مرد! میرے پاس آ۔ اور اس قفس کے دروازے کھول دے۔ اگر زندگی بھر تو نے مجھے اس قید کوٹھڑی میں بند رکھا تھا تو کم از کم ایک لمحہ کے لئے آزاد کر دے۔

نیز ؎

تو در خوابی و من مستِ ہوس ہا　　تنِ مہتاب را گیرم در آغوش [۱]

بہ دورِ افگن حدیثِ نام اے مرد　　کہ ننگم لذتِ مستانہ دادہ
مرا ای بخشد آں پروردگاری　　کہ شاعر را دلِ دیوانہ دادہ [۲]

اور پھر ایک تیسری نظم میں ؎

کاش! در بسترِ تنہائی تو　　پیکرم شمع گنہ می افروخت
ریشۂ زہدِ تو حسرتِ من　　زیں گنہ کاریٔ شیریں می سوخت [۳]

ان سبھی مثالوں کے پسِ منظر میں ایک ہنوز زندہ عورت کی ان گنت صدیوں پرانی وضعداریوں کے ملبہ تلے دبی رُوح کا کرب سنائی دیتا ہے، جو آج کے سائنسی اور تکنیکی دور میں اپنا جُدا گانہ مقام حاصل کرنے کے لئے تڑپ رہی ہے اور جسے ایران کی ایک اور شاعرہ پروین اعتصامی (وفات ۱۹۴۱ء) کے بہ قول ابھی تک سماج میں گلہ کی ایک بھیڑ سے زیادہ درجہ نہیں ملا ہے

---

[۱] تو محوِ خواب ہے اور میں ہوس ہائے گوناگوں میں مست ہوں اور چاندنی سے ہم آغوش ہو کر جی بہلا رہی ہوں۔

[۲] نام و ننگ کی باتیں چھوڑ۔ میری رسوائی ایک لذتِ مستانہ کی حامل ہے۔ یہ لذت مجھے اُس خدائے برتر نے عطا کی ہے، جس نے شاعر کو دلِ دیوانہ دیا ہے۔

[۳] کاش! تمہارے بسترِ تنہائی میں میرا جسم گناہ کی شمع روشن کر پاتا۔ پھر تمہارے زُہد اور میری حسرتوں کا خس و خاشاک اِس شیریں گنہگاری کی آگ میں جل کر راکھ ہو جاتا۔

بس کساں را جامہ و چوبِ شبانی بود لیک ۔۔۔۔ در نہادِ جملہ گرگی بود، چوپانی نہ بود[۱]

اُسے ہمیشہ کنجِ قفس میں علوم و فنون کی روشنی سے محروم رکھا گیا ؎

نورِ دانش راز چشمِ زن نہاں می داشتند ۔۔۔۔ این ندانستن زلیستی و گمراہی نہ بود

در قفس می آرمید و در قفس می داد جاں ۔۔۔۔ در گلستاں نام ازیں مرغِ گلستانی نہ بود[۲]

مرد زر اور زیورات سے اس طائرِ قفس کا دل بہلاتا رہا، حالانکہ اگر عفت و ناموس کا تحفظ ہی پیشِ نظر تھا تو زیور کی بہ نسبت اُسے جامۂ پرہیز کی زیادہ ضرورت تھی ؎

از زر و زیور چہ سود آنجا کہ نادان ست زن ۔۔۔۔ زیور و زر پردہ پوشِ عیبِ نادانی نہ بود

عیب ہا را جامۂ پرہیز پوشاندہ ست و بس ۔۔۔۔ جامۂ عُجب و ہوا بہتر ز عریانی نہ بود[۳]

پروین اعتصامی نے ایرانی عورت کی زبوں حالی پر ہی آنسو نہیں بہائے، غریبوں، ناداروں، مزدوروں اور یتیموں کے لئے بھی اُس کے دل میں گہرا درد ہے۔ اُس کی نظموں میں محنت و سرمایہ کی کشمکش کا واضح شعور ملتا ہے۔ وہ کہیں نعرہ زنی کرتی نظر نہیں آتی، مگر استحصال زدہ

---

۱ اکثر لوگوں کے پاس چرواہے کا لباس اور لاٹھی تھی، مگر اُن کی فطرت میں بھیڑیے کی صفات تھیں، چرواہے کی نہیں۔

۲ وہ لوگ عقل کی روشنی کو عورت کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھتے تھے۔ عورت کی جہالت دراصل پستی اور گمراہی کے باعث نہ تھی۔ وہ قفس میں آرام کرتی تھی۔ اور قفس ہی میں جان دے دیتی تھی۔ اس طائرِ گلستاں کا گلستان میں کوئی نام و نشان نہ تھا۔

۳ عورت نادان ہو تو زر اور زیور سے کیا فائدہ؟ زر اور زیور نادانی کا عیب نہیں چھپا سکتے۔ عیوب کی پردہ پوشی تو پرہیزگاری کا لباس ہی کر سکتا ہے۔ طمع اور غرور کا لباس عریانی سے بہتر نہیں ہوتا۔

طبقہ کو دعوتِ فکر و عمل ضرور دیتی ہے۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ اور آخر میں ایران جدید کی نوخیز شاعرہ سیمیں بہبہانی کے بعض اشعار حافظہ میں گونجنے لگتے ہیں ؎

چو درختِ فروردیں پر شگوفہ شد جانم   دامنی ز گل دارم، بر چہ کس بفیشانم[۱]

گر بوسہ می خواہی، بیا، یک نہ دو، صد، بستاں، برو

ایں جانِ بیجاں بیا، زیں جا سراپا جاں برو

صد بوسۂ تر نخشمت، از بوسہ بہر چشمت

اما ز چشم دشمناں پنہاں بیا، پنہاں برو[۲]

اور سیمیں کو بھی اپنے معاشرہ کی روائتی ثقاہت کا ہدفِ ملامت بننا پڑا تھا۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ امرتا پریتم بنیادی طور پر شاعر ہے۔ اس کی منظومات میں قلب نسوانی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ ان دھڑکنوں کے پس پردہ جہاں مشرقی ممالک کی عورت کا روحانی کرب پوشیدہ ہے، جس کا بالتفصیل اوپر ذکر ہو چکا، وہاں شاعر کی روح کا درد بھی ہے۔ جو حیات کے مختلف مراحل طے کرتی اپنی تکمیل کی جانب بڑھ رہی ہے۔ ادبی مشاغل، سماجی، ادبی اور ثقافتی تقاریب میں شمولیت، ناگ منی، کے شماروں کی تیاری، غیر ملکی کہانیوں کے

---

[۱] ماہ اوّل کے درخت کی طرح میری روح شگوفوں سے لد گئی ہے۔ یہ شگوفے کس پہ نثار کروں؟

[۲] بوسہ کا طلب گار ہے، تو آ۔ ایک دو نہیں، سو بوسے لے لے اور چلا جا۔ میرے پاس بے جان آ۔ اور سراپا جان ہو کر جا، میں تمہیں ایک سو شگفتہ بوسے دیتی ہوں۔ مجھے تمہاری آنکھوں کا صرف ایک بوسہ چاہیئے۔ لیکن یاد رہے، دشمنوں کی نظروں سے چھپ کر آنا اور چھپ چھپا کر ہی لوٹ جانا۔

ترجمہ کے سلسلہ میں ناموں کے صحیح تلفظ کی تلاش، فن کار اندرجیت کی رفاقت، کنسرلا اور تسلی کی محبت، رسوئی میں طعام کے نت نئے اہتمام، چائے اور سگریٹ کے بہترین برانڈ، گاہے ماہے یورپ کا سفر اور یوگوسلاویہ، رومانیہ، ہنگری، جرمنی میں وہاں کی ادبی شخصیتوں سے ملاقات اور ادبی اور ثقافتی محفلوں اور جشنوں میں شرکت —— یہ اور اس قسم کی ان گنت مشغولیات زندگی میں طمانیت، مسرت اور بوقلموں دلچسپی پیدا کرنے، زندگی کے سپاٹ پن میں بعدِ ثالث (تھرڈ ڈائی مینشن) پیدا کرنے اور زندگی کے بے معنی، بے مقصد خاکہ کو مقصد اور معنی عطا کرنے کے لئے کافی ہیں۔ لیکن طمانیت، مسرت اور دلچسپی کے عقب میں قیام اور آسودگی پوشیدہ ہے۔ اور محبت فی الاصل سفر ہے۔ ایک مسلسل اور بیقرار سفر! محبت ہمیشہ موضوع کی متلاشی رہتی ہے۔ وہ موضوع کو پاکر کبھی تو اس کی فرقت میں سلگتی ہے اور کبھی اُسے کھو کر اُسے اپنی جبل الورید سے بھی نزدیک سمجھتی ہے۔ وہ کبھی اپنے خول کے اندر محبوس رہ کر کسمساہٹ کو مایۂ تسکین سمجھتی ہے۔ تو کبھی اپنی ذات سے ماورا ہو کر نئے آفاق کی تلاش میں نکل پڑتی ہے۔ کبھی اُس کا مقام سمک سے بھی پست تر ہوتا ہے اور پھر کبھی سما سے بھی بلند تر مقام پر پہنچ کر اسے قرار نصیب نہیں ہوتا۔ محبت کی گہری معنویت اُس کی اپنی بظاہر بے معنی ترنگیوں میں مُضمر ہے۔ اُردو اور فارسی کی کلاسیکی شاعری میں معاملہ بندی کا جو سرمایہ ملتا ہے، اُس کا بالغ موضوع یہی شعبدہ بازیاں ہیں۔ فارسی کے عظیم شاعر مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادیؒ نے جو یہ کہا تھا کہ شعرِ خوب معنی ندارد (اچھا شعر بے معنی ہوتا ہے) تو اُن کا روئے سخن محبت کی اسی فریب کاری کی طرف تھا۔

بادی النظر میں امرتا پریتم ایک عامیانہ قسم کی مسرت پرست نظر آتی ہے، مگر محبت ناموں کا بین السطور میں مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جسم سے ماورا اور روبہ ارتقا ہے۔ وہ ہمیشہ سرگرمِ سفر رہتی ہے، آگے، آگے، ستاروں سے بھی آگے۔ بعض لوگوں کے نزدیک محبت اپنا سفر خاک و خون کی تیرگی سے شروع کرتی ہے اور روح کی سرحدی

بلندیوں پر پہنچ کر اُسے اپنی منزل نظر آنے لگتی ہے، جہاں وہ کبھی نہیں پہنچ پاتی۔ دگیہ دوں کی رائے میں سفر کا یہ سلسلہ بالکل برعکس ہوتا ہے۔ پہلا نظریہ کلاسیکی ہے اور دوسرا جدید تمدن کی پیداوار میرا اندازہ ہے کہ امرتا نے خاک و خون اور رنگ و بو کے مراحل طے کر لئے ہیں اور اب وہ اُس تجریدی کیفیت کی جانب رواں ہے، جہاں محبت موضوع سے بے نیاز ہو کر خود کو اپنا مامن و مسکن بنا لیتی ہے۔ لیکن جس طرح جب کوئی سیّارہ اپنا مدار بدلتا ہے تو اپنے گزشتہ مدار کے خصائص سے فی الفور دست بردار نہیں ہو پاتا، امرتا کے تصوّر کے نہاں خانے اب بھی کہیں کہیں خاک و خون اور رنگ و بو کی تابانیوں سے آباد دکھائی دیتے ہیں۔

محبت کی موجودہ منزل میں (اور اس منزل کا تعلق اُس زمانہ سے ہے، جب یہ محبت نامے تحریر کئے گئے تھے) امرتا کی محبت کا موضوع فن کار اندر جیت ہے، جس کا قلمی نام امروز ہے امرتا اُسے ایمی، ایمو، ایما، جیسے کئی ناموں سے مخاطب کرتی ہے۔ وہ اس کے ناگی کا فنکار ہے۔ اُس کی جانِ بہار ہے، اُس کا مرنا ہے —— اس کا سب کچھ، ہے۔ اِدھر موترا شدہ امرتا کے لئے امروز نے بھی کئی نام تلاش کر لئے ہیں۔ وہ اُس کی زوری، ماجا، برکتے، صاحبان دوست، بیگم، جاتی، دیوتا، گورو پیغمبر، شاعرہ، آرٹسٹ، قسمت، محبوبہ، ملکہ ہے۔ مگر یہ سارے کے سارے سہستر (ہزار) نام صفاتی ہیں اور ان کے پسِ منظر میں وہ ذات پنہاں ہے جو تلاے ندارد، اور جس کے بارے میں ویدِ مقدس میں کہا گیا ہے: "لا متناہی فضا کی طرح ازل سے ابد تک پھیلا ہوا، غیر مختتم، غیر مجسّم، تجریدِ محض، خاموش اور پُر سکون۔ ۔ ۔ ۔"

امروز دلّی سے نو سو میل دور روزی اور روٹی کی تلاش میں بن باس کا سراپ بھگت رہا ہے کبھی کبھی اُسے اپنے ادھورے پن پر غصّہ آتا ہے۔ کبھی سوچتا ہے، اُسے اس سفر نگ سے "پیچور ٹی" ملی ہے۔ اُسے اپنے چاروں طرف "ہر بات میں، ہر رشتے میں، ہر نظر میں، ہر انسان میں سچائی کی سمادھ، سچائی کے مقبرہ کی پرچھائیں نظر آتی ہے،" وہ حیران ہے، آج کے اکثر لوگ سچائی کو دفنا کر اُس کی پوجا کیوں کرتے ہیں۔ امرتا کے بارے میں اُس کا خیال ہے کہ وہ

"بی لونگ کرتی ہے اُس قوم کو، جس کے لوگ ماضی میں ڈوب نہیں جاتے، صرف 'آج' میں سانس لیتے ہیں۔"

لگتا ہے، امروز ابھی حدیثِ شوق کے ابتدائی ابواب پر ہے اور "رفت گیا اور بود تھا" کی گردان سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ اس کا بنیادی کارن، جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، یہ ہے کہ اُسے امرتا سے کم عمر ہونے کا شدید احساس ہے، بلکہ یہ احساس اُس کے قلب و فکر پر بُری طرح مسلط ہے۔ وہ "سمائے صفات میں الجھا ہوا ہے" لامتناہی فضا کی طرح ازل سے ابد تک پھیلی"، حقیقت سے ابھی دوچار نہیں ہوا۔ اس سارے سفر نگ، کے باوجود وہ ابھی ایمچور ہے اگرچہ سارے اسمائے صفاتی گننے کے بعد ایک دن اُسے معلوم ہوا تھا کہ امرتا کا ایک نام خدا، بھی ہے!!

امرتا کا تعلق جس قوم سے ہے، اُس کے بیشتر لوگ آج کے ترقی یافتہ زمانہ میں بھی ماضی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ 'آج' میں سانس لینے کی اکسیر ابھی تک ان کے ہاتھ نہیں لگی۔ لیکن خود امرتا نے اس 'آج' کی نبض کو پہچان لیا ہے۔ اندریوں کو جیتنے، یا بہ الفاظ دیگر اپنے افعال کو ضبط میں رکھنے والا 'اندرجیت'، امرتا کا 'آج' (امروز) ہے وقت کا ہر لمحہ جنگلی بطخوں کے سر پر سے گزر جانے یا کسی مینڈک کے شڑاپ سے جوہڑ کے پانی میں کود جانے کے بعد مر جاتا ہے۔ بلکہ ہر لمحہ کی کوکھ میں کروڑوں لمحے مسلسل مرتے اور پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف ہر لمحہ کی کوکھ میں ایک ابدیت بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔ زین بدھ ازم کی اصطلاح میں اس لمحہ کو 'ازلی، یا متحرک' لمحہ کہا جاتا ہے۔ اپنی سہولت کی خاطر ہم نے زمانہ کو ادوار میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ورنہ بنظرِ تعمق دیکھیے تو ابتدائے آفرینش سے آج تک ایک ہی لمحہ ان گنت صدیوں کی مسافت طے کرتا چلا آ رہا ہے اور ابد تک وہی لمحہ سرکتا چلا جائے گا۔ ادوار کی تقسیم میں گرفتار ہونے کا مطلب ماضی میں ڈوب جانے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

میں سمجھتا ہوں، امرتا اس فلسفہ زبان سے خوب شناسا ہے۔ اُس کا 'آج' (امروز)

زین بدھ ازم کے لمحۂ ازل ہی کا ایک مختلف روپ نظر آتا ہے۔ اسی لمحہ ازل میں سکونت پاکر انسان اسمار اور صور سے ماورا ہو جاتا ہے اور حیاتِ ابدی حاصل کر لیتا ہے۔ میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا مگر وثوق کی حد تک قیاس کر سکتا ہوں کہ اندرجیت آرٹسٹ کا قلمی نام امروز امرتا ہی کے ذہن کی تخلیق ہے۔ نام کے اس انتخاب سے ہمیں زندگی کے تئیں امرتا کے ذہنی اور روحانی روّیوں کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

نظم، ناول، افسانہ، تنقید ——— امرتا نے کم وبیش سبھی اصناف پر قلم اٹھایا ہے، مگر بنیادی حیثیت سے میں اُسے ایک شاعر، ایک غزل گو شاعر مانتا ہوں، اور یہ محبت نامے میرے نزدیک اُس کی منثور غزلیات کے نمونے ہیں۔ غزل کے واسطہ سے شعرا نے عشق ومحبت سے تعلق انسانی جذبات، معاملات ذہنی اور واردات قلبی کی نقاشی کی ہے۔ دیگر اصناف کی طرح یہاں بھی ہمیں ایک لحاظ سے دو قسم کے اسالیب بیان نظر آتے ہیں: ایک پرپیچ، آراستہ عالمانہ اور فلسفیانہ اور دوسرا صاف، سادہ اور نکھرا ہوا۔ جہاں تک اردو غزل کا تعلق ہے۔ پہلے اسلوب میں سوداؔ، غالبؔ اور مومنؔ پیش پیش ہیں اور دوسرے میں خدائے سخن میرؔ۔ اُردو کی جدید غزل میں طرزِ میرؔ کو طغرائے امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ امرتا کی منثور غزلوں میں قلبِ نسوانی کے لطیف ترین واردات کو انتہائی خلوص، سادگی اور معصومیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے میں اُسے دبستانِ میرؔ کی ایک نمائندہ سمجھتا ہوں۔ ذاتی واردات کے علاوہ امرتا نے جس موضوع پر بھی لکھا ہے، اس خلوص اور سادگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ادب سیاسیات، تمدن، فلسفہ، جنسیات وغیرہ نازک اور ادق مسائل پر اپنے مافی الضمیر کا اظہار وہ جس نرم اور بے ساختہ لہجہ میں کر جاتی ہے۔ دوسروں کے لئے اُس سے بہتر کا تصوّر قریب قریب ناممکن ہوتا ہے۔ مشہور ماہر جنسیات اور ادیب ہیولاک ایکس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُس کے قارئین تفصیلی خطوط لکھ کر اپنے دنیاوی، ذہنی اور روحانی مسائل کے بارے میں اُس سے مشورہ کیا کرتے تھے اور اُن کے طول وطویل خطوں کا جواب وہ ایک یادو لفظ سے

برجستہ فقروں میں دیتا تھا کہ مکتوب الیہ کی ساری ذہنی اور روحانی گتھیاں از خود سلجھ جاتی تھیں۔ گویا اُسے زندگی کے سبھی مسائل کا حل مل گیا ہو۔ ناگ منی کے قارئین کے خطوط کے بعض جوابات جو امرتا نے تحریر کیے تھے۔ زیر نظر مجموعہ میں شامل ہیں۔ اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ کے بارے میں اُس کے تصورات کتنے واضح، کتنے قطعی اور موثر ہیں!

جیسا کہ اوپر کہا گیا، امرتا ایک معقول انسان کی طرح ایک اَزلی آج میں سانس لیتی ہے۔ اُس کے نظریات میں کہیں کہیں بت شکنی (ICONOCLASM) بھی ملتی ہے مثلاً جب وہ کہتی ہے کہ "نفرت، غصہ اور بغاوت بھی بڑے اہم جذبے ہیں.... دنیا کی سبھی غلط قدروں کے خلاف ان کا استعمال کیا جانا چاہیئے"، تو اپنے ماضی سے یک قلم منقطع نظر آتی ہے، کیونکہ ہندی فلسفہ میں نفرت، غصہ اور بغاوت کو اہمیت نہیں دی گئی۔ وہ کس قدر غیر روایاتی ہے، جب ناگ منی میں لکھتی ہے: "تمنا انسان کی قوت ہے۔ یہی اُس کی ہر تخلیق کا راز ہے اور یہی اُس کا ارتقاء"، کیونکہ تمنا کو کبھی ارتقا کا راز نہیں سمجھا گیا۔ ہمارے ہاں ارتقا کے معنی ہیں ارتقائے نفس اور تمنائیں اس کے راستہ کا سنگِ گراں ہیں۔ مگر امرتا کے یہ نظریات آج کی زندگی کے لئے کتنے صحیح ہیں! اُس کی بُت شکنی سے جدیدیت کی سنک کی بُو نہیں آتی۔ اُس قلم سے جب یہ الفاظ ادا ہوتے ہیں تو ہمیں اُن میں بھارتیت کی روح صاف جھلکتی نظر آتی ہے: "تہذیب کا زمانہ تب آئے گا، جب عورت کی رضامندی کے بغیر اُس کا نام ہونٹوں پہ نہ لایا جا سکے گا۔"، کیونکہ اس اصول سے انحراف کرنے والے ایک راجہ کا پتلا، ہمارے ہاں صدیوں سے ہر سال جلایا جاتا ہے یا جب وہ (کرشن چندر کے حوالہ سے) لکھتی ہے: "صرف جسمانی محبت مختصر افسانہ جیسی چیز ہے، جو ایک ہی نشست میں ختم ہو جاتا ہے" یا پھر: "ذہنی حسن وقت کی تاریخ ہے، جس کا کوئی باب آخری نہیں ہوتا"، کیونکہ ہمارے ہاں آنندہ کا مفہوم ابدی مسرت ہے جو ماورا الاضداد اور ماورا الجسد ہوتی ہے۔ با الفاظِ دیگر اضداد اور عناصر اربعہ میں محبوس ہو کر مسرت تو ملتی ہے، مگر وہ ابدی

مسرت (آنند) نہیں ہوتی۔ اور جس مسرت میں ابدیت کا عنصر نہیں، وہ مسرت نہیں، طمع (موہ) ہے

اندازہ ہوتا ہے کہ خارجی اعتبار سے جدید تمدن کے کئی مناسبات اپنا لینے کے باوجود امرتا اپنی روح کی گہرائیوں میں خالصتاً بھارتی ہے۔ مثلاً وہ (بہ قول خود) انفرادیت پسند ہے اور اس لئے کسی صورت ایک مارکسی ادیب نہیں بن سکتی۔ یا پھر یہ کہ اُسے شدت سے احساس ہے کہ ہماری روایات جمہوریت کی ہیں اگر کسی منزل پہ ہم نے اشتراکیت اختیار کر بھی لی تو اُس اشتراکیت کا رنگ کچھ اور ہی ہوگا۔ ایک امریکی ادیب نے جب اُسے یہ مشورہ دیا کہ مصنف کو اپنے قارئین کے ذہن اور فکری تقاضوں کے مطابق لکھنا چاہیئے تو اُس نے دوٹوک جواب دیا: "میرا خیال ہے جو مصنف ایسا کرتا ہے، وہ سرے سے مصنف ہی نہیں.... میں ایسا مصنف نہیں بننا چاہتی۔ ہرگز نہیں! شکریہ!"

اِس تحریر کے آغاز میں لکھ آیا ہوں کہ امرتا کے معاملہ میں صیغۂ تانیث کے استعمال میں مجھے تامل ہے۔ بات دراصل یوں ہے کہ اُس کی انفرادیت، بے باکی اور بت شکنی میں مجھے ایک مردانہ پن کی شان دکھائی دیتی ہے۔ مگر ماضی کا ابطال امرتا کا محبوب شغل نہیں ہے۔ دراصل اُس کے ذہن کے اعماق میں یہ خیال پوشیدہ ہے کہ جہاں ہمارے کلچر کے کئی اصنام کسی ضرب کاری کے منتظر ہیں، وہاں کچھ ایسی صالح روایات بھی موجود ہیں، جن میں ہنوز زندگی کو صحیح جہت دینے کی صلاحیت ہے۔ زیرِ نظر خطوط میں اُس کی ذاتی حدیث شوق کے علاوہ فن، ادب، سیاسیات، کاروبار، فلم وغیرہ کے بارے میں اُس کے متوازن اور معقول نظریات کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ان سبھی نظریات کا مرکز وہ جذبۂ محبت ہے جو ذاتی بھی ہے اور آفاقی بھی، کیونکہ اُس کے ڈانڈے اُس ازلی آنچ، سے ملے ہوئے ہیں، جو ازل سے چلا آ رہا ہے اور ابد تک سرکتا چلا جائے گا۔ امرتا کے نزدیک "محبت ایک روشنی کا نام ہے۔ ایشور جیسی بے باکی کا۔ اسے چھاتیوں کی گپھاؤں میں رہ کر وقت کاٹنے کی ضرورت نہیں" اور زندگی اُس کی نگاہ میں "ایک بے سروپا خیال، ایک بے سروپا کہانی ہے۔ اسی بے سروپا کے سراور

پاؤں کی مجھے تلاش ہے۔"

اور زندگی بے سروپا میں معنی کی تلاش مذہب اور فلسفہ کا بنیادی موضوع ہوتے ہوئے ادب عالیہ کے بہترین مقاصد میں بھی شامل ہے۔

امرتا کے اسلوب کے بارے میں نرماہٹ، سادگی اور خلوص کا ذکر اوپر ہو چکا۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ انگریزی میں سوچتی اور پنجابی میں لکھتی ہے۔ انگریزی الفاظ کا استعمال بھی اُس کی تحریروں میں بکثرت ملتا ہے، حالانکہ اُن میں سے بیشتر کے پنجابی مرادفات بہ آسانی اُسے مل سکتے تھے۔ جن لوگوں نے ڈپٹی نذیر احمد، حالیؔ اور سرسید کی تحریریں دیکھی ہیں، اُن کے لئے اسلوب غیر مانوس نہ ہوگا۔ مگر امرتا کے طرزِ تحریر کا مایہ الامتیاز اُس کا لہجہ ہے۔ ان تحریروں میں ایسے فقرے بکثرت ملتے ہیں، جن میں انگریزی کا ایک لفظ نہیں ہوتا۔ مگر لہجہ سراسر انگریزی کا ہوتا ہے۔ پھر ایسے فقرے بھی کثرت سے ہیں، جن میں جملہ ہائے معترضہ نصب ہیں۔ ترجمہ میں نہ تو لہجہ میں تبدیلی لانے کی سعی کی گئی ہے اور نہ جملہ ہائے معترضہ کے بجائے علیحدہ فقرے وضع کئے گئے ہیں، تاکہ اردو ترجمہ کے باوجود قارئین امرتا کے اپنے اسلوب سے لذت آشنا ہو سکیں۔

پیشِ لفظ میں امروز نے اس مجموعۂ خطوط کو امرتا پریتم کی خود گذشت "رسیدی ٹکٹ" کی جلد دوم قرار دیا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ "رسیدی ٹکٹ" امرتا کی سرگزشت (بیوگرافی) ہے تو محبت نامے اُس کی دِل گذشت (سائیکوگرافی) جلد اوّل میں ہمیں امرتا کی زندگی کا جسم نظر آتا ہے اور جلد دوم میں اُس کے باطنی پہلو، اُس کی روح کی گہرائیوں سے ہم آشنا ہوتے ہیں۔ رُوح اور جسم کا انسلاک ہی تو ہے جسے زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

کرشن کانت

(چمن زار)

محلہ شوکوٹ

بٹالہ (پنجاب)

۱۳ر فروری ۱۹۸۱ء

پیشِ لفظ

امرتا نے سب سے پہلا خط جو میرے نام لکھا، وہ صرف ایک سطر کا تھا۔ وہ مجھے بمبئی میں موصول ہوا تھا، جب میں شمع اور دہلی کو چھوڑ کر گورودت کے ساتھ کام کرنے کے لئے وہاں گیا تھا وہ ایک سطر یہ تھی ــ "بمبئی اپنے آرٹسٹ کو خوش آمدید کہتی ہے" اس خط میں امرتا نے مجھے کسی نام سے مخاطب کیا تھا اور نہ اپنا نام لکھا تھا۔ جس دن وہ خط مجھے بمبئی میں ملا اس دن مجھے لگا تھا، جیسے امرتا کے وجود کا نام بمبئی بھی ہو۔

میں امرتا کو بہت سے ناموں سے بلاتا آ رہا ہوں ــ بلاتا ہوں۔ آشی سے لے کر "برکتے" تک کئی نام ہیں۔ مجھے جو بھی خوبصورت لگتا ہے، اسی نام سے میں اُسے پکارنے لگتا ہوں۔ جو بھی مجھے مؤثر لگتا ہے، وہی اُس کا نام رکھ دیتا ہوں۔ جب میں نے "زوربا دی گریک" پڑھا تھا تب میں اُسے زوربا کہہ کر پکارنے لگا تھا۔ ہسپانوی فنکار گویا پہ لکھے ناول "دی نیکڈ ماجا" کا مطالعہ کرنے کے بعد نہ جانے کتنا عرصہ میں اُسے ماجا کہہ کر پکارتا رہا اور اسی نام سے اب بھی میں کئی بار اُس سے مخاطب ہوتا ہوں۔ اس نام سے مجھے ایک یگانگت کا احساس ہوتا ہے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ مراٹھی زبان میں ماجھا کے معنی ہیں میرا۔ شاید اسی لئے وہ نام مجھے بہت اپنا اپنا سا لگا۔ یوں تو گھر میں، رسوئی میں اُسے "برکتے" ہی کہہ کر بلاتا ہوں۔ وہ واقعی میری برکت ہے۔ طبیعت کی افتاد سے میں ملازمت نہیں کر سکتا۔ اپنے کاروبار میں کبھی کبھی کم کام بھی ہو جاتا ہے۔ مگر میں نے کبھی کوئی کمی محسوس نہیں کی۔ برکتے کا لمس پا کر میرا تھوڑا بھی بہت

ہو جاتا ہے۔

ایک رات باتوں باتوں میں دو بج گئے۔ اُس دن صبح سے ہی امرتا کے کندھوں میں درد ہو رہا تھا۔ وہ بستر پر لیٹی تھی، میں اُس کے قریب میں بیٹھا تھا کہ اچانک ایک بات جیسے خود بخود ذہن میں آ گئی ہو ـــــ ایک کتاب کی بات۔ امرتا یک لخت اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ فائل سنبھالی اور اُسی وقت بستر پر بیٹھے بیٹھے کتاب کی تیاری شروع کر دی۔ میں حیرت میں اُس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ امرتا بہت شگفتہ اور صحت مند دکھائی دے رہی تھی ـــــ جیسے درد خود ذرا دور ہٹ کر متحیر کھڑا تھا۔ میں بھی متحیر رہ گیا ـــــ چائے بنائی۔ پھر چائے کا پیالہ دیتے ہوئے میں نے امرتا سے پوچھا "تم کس پر گئی ہو؟" اُس نے معصومانہ انداز میں جواب دیا "خدا پر"۔ اُس دن میں نے جانا کہ امرتا کا ایک نام خدا بھی ہے۔ لیکن اس نام سے میں نے اُسے کبھی مخاطب نہیں کیا، صرف دیکھتا ہوں ـــــ جب بھی وہ کام کرتی ہے۔

امرتا کے الفاظ میں ـــــ میرے محبوب! میرے تصوّر! میری ساری زندگی مجھے ایسی لگتی ہے، جیسے میں نے تمہیں ایک خط لکھا ہو۔ میرے دل کی ہر دھڑکن ایک حرف ہے، میری ہر سانس جیسے کوئی [illegible]تا ہو، ہر دن جیسے کوئی فقرہ ہو اور ساری زندگی جیسے ایک خط۔ اگر وہ خط تم تک پہنچ جاتا، مجھے کسی بھی زبان کے الفاظ کا محتاج نہ ہونا پڑتا۔" (امرتا کی تصنیف "کالا گلاب")

اور اس کے علاوہ امرتا کی کئی ایسی تصانیف ہیں جو خطوط کی صورت میں ہیں۔ مثلاً:

"سنہیڑے" ایک طویل نظم جو ساحر کا ایک خط ملنے سے شروع ہوتی ہے۔ نظم اُس نے ۱۹۶۳ء میں لکھی تھی اور ۱۹۶۳ء میں ہی مکمل کی۔ "آخری خط" جو اُس نے ساحر کا نام لئے بغیر ساحر کو مخاطب کر کے ۱۹۶۶ء میں لکھا تھا۔ امرتا سے میری جان پہچان کا یہ پہلا سال تھا۔ اُن دنوں میں اردو کے رسالوں شمع اور آئینہ کے لئے کام کرتا تھا۔ جب "آخری خط" آئینہ میں چھپنے کے لئے آیا تو میں امرتا سے ملا اور دریافت کیا "یہ خط تم نے کس کے نام لکھا ہے؟ تم بتاؤ تو میں اس کے ساتھ اس کی تصویر بنا دوں"۔ تب وہ کچھ کہنے میں جھجک محسوس کر رہی تھی اور میں نے اس

"آخری خط"، کے ساتھ جیسا جی میں آیا، ایک تصویر بنا دی تھی۔

"آخری خط"، عنوان کی نظم جو امرتا نے حال کی صورت حال سے دھرتی کے مستقبل کے نام لکھی تھی (نظموں کا مجموعہ "کاغذ اور کینوس")۔ "ایک خط" عنوان کا مضمون جو امرتا نے اپنے وارث کے نام لکھا تھا (کتاب سفر نامہ) "ایک خط"، عنوان کی نظم: لکھ تو تمام دھرتی، پڑھ تو تمام لوگ، جس میں امرتا نے دنیا کے حکمرانوں اور سائنس دانوں سے تخاطب کیا تھا (نظموں کا مجموعہ کاغذ اور کینوس) نظم عہد نامہ: بھی ایک خط تھی۔ اس میں امرتا نے کہا تھا: "اس کا عہد نامہ! دنیا والو آؤ، دستخط کرو۔" یہ خط اُس نے ستمبر ۱۹۶۵ء میں تاشقند میں لکھے جا رہے ہند و پاک عہد نامہ کے موقع پر تحریر کیا تھا (نظموں کا مجموعہ "میں توں") "ایک خط" عنوان کا مضمون جو امرتا نے نومبر ۱۹۶۵ء میں پاکستان کے نام لکھا تھا (ماہنامہ آرسی "سنگھ ام انک" ۱۹۶۰ء) اور "نامۂ خلوص" عنوان کا مضمون جو اس نے ۱۰ر فروری ۱۹۷۰ء کو پاکستان کے ہم قلم دوستوں کے نام لکھا تھا۔

لیکن یہ سارے خطوط تو اُس کی مختلف تصانیف کا حصّہ ہیں، اس لئے میں نے زیرِ نظر مجموعہ میں انہیں شامل نہیں کیا۔ ان کے علاوہ اُس کی نظم "سال مبارک"، بھی ایک خط تھی جو ہماری ملاقات کے دوران اُس نے جنوری ۱۹۶۱ء میں مجھے بمبئی بھیجی تھی ـــــ صرف نظم! اس کے ساتھ کوئی خط نہ تھا۔ اس لئے کہ وہ نظم خود ایک خط تھی اور کہانی "روشنی کی آہیں" بھی اُسی ماہ ڈاک سے اُس نے مجھے ارسال کی تھی ـــــ جو میرے نام اُس کا ایک اور خط تھا لیکن یہ تخلیق بھی اُس کی دوسری کتابوں میں شامل ہیں اور اسی کارن میں انہیں اس کتاب میں شامل نہیں کر رہا۔

یہاں میں نے صرف وہی خطوط جمع کئے ہیں جو مجھے سیدھے ڈاک سے ملے تھے، اُس کی ادبی تصانیف کے ذریعہ نہیں۔ تصانیف تو کتابوں کے ذریعہ ملے خطوط ہوتی ہیں۔ یہ سبھی خطوط میرا سرمایہ ہیں اور میری دانست میں امرتا کی خود گذشت "رسیدی ٹکٹ"، کا ایک حصّہ۔

ـــــ امروز

تمہارے اس قدر حسین خطوط، جیتی! میرے تصور سے بھی کہیں زیادہ حسین! جن کا میں ساری زندگی انتظار کرتی رہی ـــــ چاہے وہ انتظار صرف انتظار ہی رہا۔ نہ جانے کتنی نظموں میں ان کے جواب لکھتی رہی۔ آج وہ جواب حقیقت بن گئے۔ لیکن آج میرا دل میرے بس میں نہیں آرہا۔ آنکھوں میں آنسو اُمڈ اُمڈ آتے ہیں ـــــ میری زندگی کے سال، اس حقیقت کو دیکھنے کے لئے، ایک جگہ پہ رک کیوں نہیں جاتے؟ آگے کیوں بڑھے جاتے ہیں؟ آج وہ تمہارے ساتھ مل کر نہیں چل رہے!

تم مجھے اُس طلسمی وادی میں بلا رہے ہو، جہاں میری زندگی لوٹ کر نہیں جا رہی۔ عمر دل کا ساتھ نہیں دے رہی۔ دل اُسی مقام پہ رک گیا ہے، جہاں تم نے اُسے رُکنے کا اشارہ دیا تھا۔ سچ مانو، اُس کے پاؤں وہیں رُکے ہوئے ہیں۔ لیکن آج کل، مجھے لگتا ہے، ایک ایک دن میں کئی کئی سال بیتے جا رہے ہیں اور اپنی عمر کے اتنے بیتے برسوں کا بوجھ مجھ سے سہا نہیں جا رہا......

تمہاری ــــ امرتا

۳۰ ــ ۱۰ ــ ۱۹۵۹ء

میری تقدیر!

راجن کا وجود اس دھرتی پر کہیں نہیں تھا۔ اُس نے صرف میرے سپنوں پر قبضہ جما رکھا تھا اور پھر جس دن تم نے "اشو" پڑھ کر مجھے فون کیا: "میں تمہارا راجن بول رہا ہوں،" اُس دن دھرتی کی بات بن گئی۔ اس بات نے کرم بھی کیا اور قہر بھی۔ تمہاری نگاہ نے میرے اوپر سے برسوں کا چھایا کہرا ہٹا دیا ہے اور آج جب میں اُس نگاہ کو نو سو میل کے فاصلہ پہ بھیج کر آئی ہوں، ایک اور کہرا میرے اوپر چھا رہا ہے وہ نگاہ جن مجبوریوں میں مجھ سے

بچھڑتی ہے، اُس کا احساس مجھے ہے اور اسی کے سہارے تمہاری رفت میں چھلنے والے کہرے کو میں اپنے اُوپر سے ہٹاتی رہوں گی اور جب میرے سامنے پھر تمہاری نگاہ ہوگی، میرے من کا رنگ اُسی طرح گلابی ہوجائے گا......

تمہاری — بیگم

۲۱—۱—۱۹۶۰ء

میرے ایمان!

تمہاری ملاقات نے میرے قلم کی چنگاریوں کو شعلہ بنادیا۔ کل نیپال نے اُس قلمی آگ کی پھولوں سے عزت افزائی کی، اور مجھے جتنے پھول ملے، میں نے سارے تمہاری یاد پر چڑھادیئے۔

"ہجر کی اس رات میں کچھ روشنی سی آرہی"...... میری اس نظم میں تمہاری یاد کا چراغ پلک پلک کر جل رہا تھا۔ رات کو ساڑھے گیارہ بجے تک اسی روشنی کا ذکر چلتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی نہ جانے کتنی نیپالی، ہندی اور بنگالی نظمیں جگمگاتی رہیں۔ ایک فارسی کا شعر بھی تھا، جس کا مطلب تھا: "ریگستان میں ہم دھوپ میں چمکتی ریت کو پانی سمجھ کر بھاگتے ہیں، دھوکا کھاتے ہیں، تڑپتے ہیں، لیکن لوگ کہتے ہیں کہ ریت ریت ہے، ریت پانی نہیں بن سکتی۔ اور کچھ عقلمند لوگ اس ریت کو پانی سمجھنے کی غلطی نہیں کرتے۔ وہ لوگ عقلمند ہوں گے۔ مگر میں کہتی ہوں، جو لوگ ریت کو پانی سمجھنے کی غلطی نہیں کرتے، اُن کی پیاس میں کچھ نہ کچھ خاص ہوگی، اُن کے ہونٹوں پر وہ شدت نہیں ہوگی۔"

سچ، میرے جیتی! مجھے وہ عقلمندی نہیں چاہیئے۔ مجھے اپنی پیاس مبارک ہے، چاہے وہ مجھے ساری عمر ریگستان میں بھٹکاتی رہے۔ میرے جیتی کو، میری پیاس کے چھلاوے کو، میری ساری یاد پہنچے!

کھٹمنڈو

— آشی

۲۷—۱—۱۹۶۰ء

"مسافر! تم مجھے شام کے وقت کیوں ملے؟ زندگی کا سفر ختم ہونے والا ہے۔ نہیں اگر ملنا ہی تھا تو زندگی کی دوپہر میں ملتے۔ اُس دوپہر کی تپش تو دیکھ لیتے"، کھٹمنڈو میں کسی نے یہ ہندی نظم پڑھی تھی۔ کئی بار کئی لوگوں کا درد کتنا مشابہت رکھتا ہے! میری زندگی کے اس اختتام پذیر سفر اب مجھے صرف تمہارے خطوں ہی کا انتظار رہتا ہے۔

میرا یہ انتظار تمہارے شہر (بمبئی) کی دیواروں سے ٹکرا کر ہمیشہ زخمی ہوتا رہا ہے۔ پہلے بھی چودہ برس ـــــ رام بن باس جتنے ـــــ اسی طرح بیت گئے۔ باقی ماندہ سال بھی لگتا ہے۔ اس قطار میں آ لیں گے۔ آج تک تمہارا ایک ہی خط آیا ہے۔ شاید تمہیں کھٹمنڈو کا پتہ بھول گیا ہو۔ وہاں ہر روز میں تمہارے ایک ایک حرف کا انتظار کرتی رہی۔ وہاں لوگوں کے پاس میرے لئے کئی الفاظ تھے، دل کو چھو جانے والے، مگر انہوں نے دل کی چنگاری کو اور بھڑکا دیا اور جلا دیا۔ مجھ سے اُس کی تپش سہی نہ گئی۔ تین دن کے انتظار کے بعد مجھے بخار ہو گیا۔ کل واپس آئی۔ راستہ میں ہوائی جہاز بدل کر ـــــ سیدھے سفر کی سیٹ نہ ملی تھی۔ انتظار کہہ رہا تھا کہ پہنچنے پر میرے لئے کوئی نہ کوئی پیغام ضرور ہوگا۔ نہ جانے، تمہارے الفاظ اتنے کنجوس کیوں ہو گئے ہیں! آج کی ڈاک بھی آ چکی۔ سوال کا جواب بننے والے! مجھے اس خاموشی کے معنیٰ سمجھاتا جا۔

۱-۲-۱۹۶۰ء

میرے نغموں کی جان!

آج تمہارا خط ہمیں نصیب ہوا ہے۔ میں زندگی کی شکر گزار ہوں، جس نے میرے خطوں کے جواب مجھے لا کر دیئے۔ مگر میرے سارے خطوط تمہیں کیوں نہیں ملے؟ یہ میرا ساتواں خط ہے۔ تین میں نے نیپال جانے سے پہلے لکھے تھے۔ ایک تو اُسی دن لکھا تھا، جب میں اپنا سکون نو سو میل دور بھیج کر آئی تھی، ۲۱ تاریخ کو۔ اور پھر ہر روز لکھتی رہی۔

کبھی میں نے دل کے سارے اُلہنے کے ساتھ لکھا تھا: "یہ میرا عمر کا خط اکارت گیا۔ تمہارے

دل نے محبوب کا جو پتہ لکھا تھا، وہ ہماری تقدیر سے پڑھا نہ گیا۔" لیکن آج جب وہ پتہ سامنے ہے۔ ان ڈاک خانہ والوں نے، لگتا ہے، تقدیر سے سانٹھ گانٹھ کر لی ہے، ان سے بھی وہ پتہ پڑھا نہیں جا رہا۔

نیپال میں ٹیگور کا ایک گیت سنا تھا:

تو ہی میرا سمندر ہے، تو ہی میرا ناخدا

اور میں ایک کشتی ہوں۔ تمہیں کنارے لگانے کے لئے کیوں کہوں؟

ڈوب بھی جاؤں تو تجھ میں ہی ڈوبوں گی!

کیونکہ تو ہی میرا سمندر ہے، تو ہی میرا......

اس گیت نے بڑا سہارا دیا۔

تمہاری ——— آشی

۵-۲-۱۹۶۰ء

کل دوپہر خرشچیف کو جواہر لال جی نے اپنے گھر پہ لنچ دیا تھا۔ وہاں گئی تھی۔ پنڈت جی مجھے بہت اچھے لگتے ہیں، انسانیت کی ساری خوبصورتی کا مجسمہ۔ کچھ دیر تک تو میں بہت خوش رہی۔ پھر تمہاری جدائی سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور مجھے سبھی دن، سبھی کام، سبھی ملاقاتیں بے معنی سی لگنے لگیں.....

——— آشی

۱۳-۲-۱۹۶۰ء

تمہیں آنا تھا ۱۸ تاریخ کو اور نہیں آئے۔ یہ وہ صبح تھی جب سورج طلوع نہ ہوا۔ میری اور سورج کی قسمت! تمہیں کیا؟

میری طرح پورن کی سندراں نے بھی ایک دن کہا تھا "ایک دن بن کو چلے گئے تو پھر سندراں کے پاس نہیں آئے۔ ارے لوگو! جوگی کسی کے میت نہیں ہوتے۔ فن کے جوگی! کیا ہر صدی میں سندراں کا یہی حال ہوگا؟

....

تقدیر کی لکیروں کو کوئی نہیں بدل سکتا، جیننی! کل میں نے تمہارا کمرہ صاف کیا، شیشوں کو پونچھا کہ شاید ان میں میری تقدیر کا چہرہ دکھائی دے جائے۔

"سپنے نئے بن سکتے ہیں۔" تمہارے یہ الفاظ میرے کانوں میں بول رہے ہیں، ایک شور سا بنتے جا رہے ہیں، ایک بھیانک شور، اور میں شاید اس شور میں پاگل ہو جاؤں گی۔

نہیں، نہیں! تمہارے نئے سپنوں کا محل بنانے کے لئے اگر مجھے اپنی زندگی کو کھنڈر بھی بنانا پڑے، تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ کوشش کروں گی، میری ایک سرد آہ بھی تمہارے شہر میں نہ پہنچ جائے۔ تمہاری ترقی کے راستہ میں میرا درد حائل نہ ہو۔

بدنصیب ــــ آشی

ارے مرزا!

اپنی نیلی[1] کو سنبھال لو اور اپنی صاحبان کو بھی۔ جو چار دن زندگی کے دیئے تھے۔ اُن میں دو کی جگہ تین آرزو میں گزر گئے اور باقی ایک صرف انتظار میں ہی بیت جائے۔ ناشدنی کو شدنی بنا لو، مرزا!

---

[1] نیلی ہماری پہلی کار کا نام تھا۔ یہی نام داستان میں صاحبان کے عاشق مرزا کی گھوڑی کا بھی تھا۔

پرسوں شام مجھے ہلکا سا بخار ہو گیا تھا۔ کل بڑھ گیا۔ رات بھی اسی طرح کٹی۔ جگرؔ نے شاید میری حالت پہ ہی کہا تھا۔

اس درجہ بیقرار تھے دردِ نہاں سے ہم
کچھ دُور آگے بڑھ گئے عمرِ رواں سے ہم

میری جان! اُڑ کر آجاؤ۔ میرے دل کے پر ادھار لے لو!.....

جانِ بہار!

تمہارا یہ روپوں والا چیک میں کیش نہیں کراؤں گی۔ صرف تمہاری محبت کا چیک کیش کرانا ہے، اگر زندگی کے بنک نے کیش کر دیا تو۔

تمہاری — آشی

۲۱ — ۲ — ۱۹۶۰ء

تمہارا پھول سا خط ملا۔ وفا کی خوشبو ملی۔ اور میں نے اس خوشبو کے کتنے ہی لمبے لمبے گھونٹ بھر لئے۔ ایک گھونٹ بھر رہی تھی کہ سیٹھی[1] کا فون آیا۔ میری آواز سن کر وہ کہنے لگا۔ "آج آپ کی آواز خوش ہے"۔ میں نے کہا "ابھی خط آیا ہے۔ میری آواز میں اُس کی پرچھائیں ہو گی۔" سیٹھی بہت ہنسا۔

آج سچ مچ ہجر کی رات میں روشنی آنے والی بات ہے۔ تیرے اس پیارے خط نے میری یاد کے چراغ کو بھرپور روشن کر دیا ہے ——— جی چاہتا ہے، تم ابھی کہیں سے نمودار ہو جاؤ۔ چاہے دھرتی سے اُگ آؤ۔ چاہے آکاش سے آگرو۔

ہمیشہ سے تمہاری — آشی

۲۲ — ۲ — ۱۹۶۰ء

---

[1] میرا مصور دوست سیٹھی

میری تقدیر!

گاڑی میں سیٹ نہ ملے تو ہوائی جہاز میں سیٹ لے لینا۔ پیسوں کا خیال نہ کرنا۔ جو رقم زیادہ لگے، وہ میرے ذمہ! مجھے جدائی کے نغموں سے کچھ زیادہ محبت نہیں۔

وصال کی اس منزل سے پیار ہے، جس کا شدید سفر طے کرنے کے لئے میں نے جدائی کے گیت لکھے تھے۔ مجھے اُس شہرت سے محبت نہیں، جو جدائی کے نغموں سے مجھے ملی ہے۔ میں زندگی کے اُس جلوے کا انتظار کر رہی ہوں، جس سے مجھے میری منزل کا دیدار نصیب ہوگا۔ آؤ اور مجھ سے اپنی دیوانگی کو ناپ لو۔ مجھے لگتا ہے، جیسے ساحر کی محبت کے چودہ سال بھی تم تک پہنچنے کا ایک راستہ تھے......

تمہاری اپنی —— آشی

۲۴ — ۲ — ۱۹۶۰ء

میرے اچھے جیتی!

آج میرے کہنے پر، کبھی، اپنے سونے کے کمرہ میں جانا، ریڈیوگرام چلانا اور پریم کی آواز سننا: "سن میرے بندھورے! سن میرے متوا! سُن میرے ساتھی رے!" اور مجھے بتانا، وہ لوگ کیسے ہوتے ہیں، جنہیں کوئی اس طرح سے آواز دیتا ہے۔ میں ساری زندگی تصور کے گیت لکھتی رہی، لیکن میں جانتی ہوں —— میں وہ نہیں ہوں، جسے کوئی اس طرح سے آواز دے۔ اور میں یہ بھی جانتی ہوں، تم وہی ہو، جسے میں یہ آواز دے رہی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں، میری آواز کا کوئی جواب نہ آئے گا۔

کل ایک خواب سا تمہارا خط ملا تھا۔ لیکن مجھے تمہاری من کے کان فلکٹ کا بھی پتہ ہے۔ یوں تو میں تمہارا اپنا انتخاب ہوں۔ تاہم میری عمر اور میرے رشتے تمہارا کان فلکٹ ہیں۔ تمہارا چہرہ دیکھا، تمہاری آواز سنی۔ تو میری آوارگی ختم ہو گئی۔ لیکن آج تمہارا چہرہ متفکر ہے

کیا اس دھرتی پر مجھے ابھی اور چلنا ہے، جہاں میرے لئے تمہارے خوابوں نے دروازے بند کر لئے ہیں؟

تمہارے پاؤں کی آہٹ سن کر میں نے زندگی سے کہا تھا "ابھی دروازہ بند نہ کرو، حیات! ریگستان سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔" لیکن آج مجھے تمہارے پاؤں کی آہٹ سنائی نہیں دے رہی۔ اب زندگی سے کیا کہوں؟ کیا یہ کہوں کہ اب سارے دروازے بند کر لے؟.....

....

۲۶-۴-۱۹۶۰ء

میرے سب کچھ!

میں کہیں[1] نہیں جا رہی ہوں۔ تمہارے بغیر مجھے کوئی بھی جگہ اچھی نہیں لگتی۔ مجھے غیر ملکی شہرت نہیں چاہیے۔ میں نے جس کے لئے محبت کے گیت لکھے، اگر اُسے میرے گیت قبول نہیں تو بیگانوں سے اُن گیتوں کی تعریف پا کر کیا کروں گی؟ ایک گجراتی گیت ہے: "ماتھے کے کشکول میں لاکھوں موتی رہے، دل کی بستی خالی" دانشمندی کے لاکھوں موتی، لیکن دل تمہارے بغیر خالی! ہر جگہ جانے کے لئے مجھے پاسپورٹ کا فارم پُر کرنا پڑتا[2] ہے۔ اور میں اس قسم کی کوئی چیز پُر کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ جو تمہاری مسرت چھین لے۔ جہاں میری زندگی تم پر قربان ہے، وہاں میں غیر ملکی شہرت بھی قربان کر دوں گی۔ میں کہیں بھی نہ جاؤں گی۔ تمہارا انتظار کروں گی عمر بھر۔

تمہاری — آشی

۲۶-۴-۱۹۶۰ء

---

[1] اُس سال امرتا کو رُوس میں مدعو کیا گیا تھا۔

[2] پاسپورٹ فارم پُر کرنے کے لئے عورت کو اپنے خاوند کا نام لکھنا پڑتا ہے۔ امرتا نے ایک بار فارم پُر کیا تھا، لیکن مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں نے چاک کر ڈالا۔

میرے جیتی!

جیوتیؔ میرے سامنے بیٹھی ہے۔ حسین، اچپل اور میلے میں جھولا جھولنے والی جیوی پھر اُس نے ایک چہرہ دیکھ لیا اور پاگل ہو اُٹھی۔ قسمت نے چہرہ تو دکھا دیا، مگر اِس راستہ کی ٹھوکریں نہ دکھائیں اور جیوتیؔ اُس چہرہ کے پیچھے پیچھے چل پڑی، جہاں بھی لے گیا۔ نہ ذات ملی، نہ راستہ، وہ حالات کے حوالے ہو گئی۔ جس سکھ کو دیکھ کر چل پڑی تھی، اُس نے بھی خبر نہ لی۔ کتنا ہی درد دیتی رہی اور آخر اُسے زندگی کی ٹھوکروں نے پاگل کر دیا۔ پاگل جیوتیؔ کو اُس کے محبوب نے دیکھا۔ حسین جیوی کو اُس نے سماج کی خاطر چھوڑ دیا تھا لیکن گلی کوچوں سے ٹکڑے اکٹھا کرنے والی پاگل جیوتیؔ کو وہ نہ چھوڑ سکا۔ اُس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ سماج کے سامنے، ساری سماجی قدروں کے سامنے۔

جیوتیؔ میرے قلب میں سمائی جا رہی ہے —— میرے قلم میں، میرے تصوّر میں، میری حقیقت میں۔ میرے جیتی! جب میں جیوتیؔ کی طرح ہوش کھو بیٹھوں گی، شاید پھر تمہارے من میں اُس دن والا فیصلہ بیدار ہوگا، جب تم میرا ہاتھ پکڑ کر انگوٹھیاں خریدنے کے لئے چل پڑے تھے۔ تمہاری وہی یگانگت بیدار ہوگی، تمہارا رشتہ بیدار ہوگا اور اُس رشتہ کی لاج بیدار ہوگی۔

تمہاری دکھی —— آشی

۲۶ —— ۴ —— ۱۹۶۰ء

میرے ایمان!

زندگی کے سکھ دکھ، اپنے اور میرے، دو ندیوں کی طرح مل جانے دو۔ اور پھر جیسے پانی میں لکیر نہیں پڑتی، میرے اور تمہارے وجود کے درمیان کوئی لکیر نہ کھنچ سکے گی۔

تمہاری سلامتی چاہنے والی، تمہاری —— آشی

۲۹ —— ۴ —— ۱۹۶۰ء

لہ اُن دنوں امرتا گجراتی ناول 'جیوی' کا ترجمہ کر رہی تھی۔

مئی ۱۹۶۰ء میں امرتا اور میں بمبئی گئے،۱ اپنی پہلی نیلی کار میں۔ پہلی رات گوالیار میں ہوئی اور دوسری اندور میں۔ اُن دنوں امرتا نوتیج کو اپنا بہترین دوست مانتی تھی اس لئے اپنی مسرت اُس کے ساتھ بانٹنا چاہتی تھی۔ اس رات اندور کے لینٹرن ہوٹل سے اُس نے نوتیج کے نام ایک خط لکھا۔ اصل خط آج بھی نوتیج کے پاس ہے۔ لیکن اُس نے اُس کی نقل ارسال کر دی ہے، جس کے لئے میں اُس کا شکرگزار ہوں۔ یہ خط ۹ رمئی ۱۹۶۰ء کی رات کو لکھا گیا تھا:

پیارے نوتیج!

۱۹۵۳ء نے ایک سوال اُٹھایا تھا: "نو سو میل ریت ہی ریت نے پکھی ہے"۔ اب ۱۹۶۰ء کی ڈاچی نے اپنے گلے کی گھنٹی بجا کر کہا ہے: "میں اُس ریگستان کو پار کروں گی"۔ اُس نے ۸ تاریخ کی صبح نو کا آٹھ اور آٹھ کا سات بنا دیا۔ آج ۹ تاریخ کو اُس ڈاچی نے سات کا چھ، چھ کا پانچ، پانچ کا چار اور چار کا تین بنا دیا۔ باقی ۳۰۷ میل رہ گئے ہیں۔ ان نو سو میلوں نے کبھی مجھ سے سنہرے، آخری خط، ایک سوال اور کستوری لکھوائے تھے۔ ہیمنگ وے کا ناول دی اولڈ مین اینڈ دی سی، پڑھ رہی تھی پرسوں پرسوں۔ چوراسی دن کے فاقوں اور تلاش کے بعد وہ ماہی گیر کہتا ہے: "آج پچاسویں دن کیا میں تھوڑی سی قسمت نہیں خرید سکتا؟ میرا خیال ہے، قسمت خرید لینا اب میرا حق ہے۔ میرا خیال ہے، چوراسی دن کی بھوک اور تلاش کے بعد میں اُس کی قیمت ادا کر چکا ہوں۔"

یہ سنہرے، آخری خط، ایک سوال اور کستوری لکھ کر کیا میں نو سو میلوں کی قیمت ادا نہیں کر چکی ہوں؟ اب ان میلوں کو پار کر لینے پر میرا حق ہے! مجھے لگتا ہے، واریجی اس ریگستان میں مجھے ایک ایک گھونٹ پانی دیتے رہے ہیں۔ اُن کی آواز میرے کانوں کی امانت ہے۔

---

۱ نوتیج کے والد اور ماہنامہ "پریت لڑی" کے مشہور مدیر سردار گوربخش سنگھ۔

اُن سے کہنا، میں یہ امانت سنبھال کر رکھوں گی۔ اس سفر میں میرا یہ پہلا خط آپ کے اور دارجی کے نام ہے۔

لینرٹن ہوٹل — آپ کی —— امرتا

۹ — ۵ — ۱۹۶۰ء

یہ ۱۹۶۱ء کے شروع کے خطوط ہیں، جن پر نہ کوئی تاریخ ہے اور نہ دستخط۔ اُن دنوں امرتا نے ایک کہانی لکھ کر مجھے بھیجی تھی —— "روشنی دا ہوکا"، اس میں اس کا ایک خط تھا۔ پھر ایک نظم ارسال کی تھی "سال مبارک"، یہ بھی اس کا ایک خط تھی۔ پھر ایک ناول بھیجا —— آئن رینڈ کا "فاونٹین ہیڈ"، یہ بھی میں نے اس کا ایک خط سمجھ کر پڑھا تھا۔ یہ خطوط جن میں امرتا نے نہ کوئی تاریخ لکھی تھی نہ اپنا نام، اُس نے اپنے غصّہ کی چلچلاتی دوپہر میں لکھے تھے —— شاید غصّہ میں نہ وقت یاد رہتا ہے نہ نام:

جیتی!

تمہارے اور میرے نصیبوں میں بہت فرق ہے۔ تم وہ خوش نصیب انسان ہو، جس سے تم نے محبت کی، اُس نے تمہارے اشارہ پر ساری دُنیا تم پر قربان کر دی۔ لیکن میں وہ بدنصیب انسان ہوں، جس سے میں نے محبت کی، اُس نے میرے لئے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا۔ دکھوں نے اب میرے دل کی عمر بہت بڑھا دی ہے اب میرا دل امید کے کسی کھلونے کے ساتھ کھیل نہیں سکتا۔

ہر تیسرے دن پنجاب کے کسی نہ کسی اخبار میں میرے بمبئی میں گزارے دنوں کا ذکر ہوتا ہے۔ برُے سے برُے الفاظ میں۔ لیکن مجھے اُن سے کوئی شکوہ نہیں، کیونکہ اُس کی سمجھ مجھے سمجھ سکنے کے قابل ہی نہیں ہے۔ صرف دکھ اس بات کا ہے کہ مجھے اُس نے بھی نہیں سمجھا، جس نے کبھی مجھ سے

کہا تھا: "مجھے جواب بنالو سارے کا سارا۔"

مجھے اگر کسی نے سمجھا ہے تو وہ تمہاری میز کے دراز میں پڑی رنگوں کی بے زبان شیشیاں ہیں، جن کے بدن میں ہر روز پونچھتی، پچکارتی تھی۔ وہ رنگ میری آنکھوں میں جھانک کر مسکراتے تھے، کیونکہ انہوں نے میری نظر کا راز پا لیا تھا۔ انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ مجھے تمہاری تخلیقی قوت سے ایسی محبت ہے۔ وہ رنگ تمہارے ہاتھوں کے لمس کے لئے ترستے رہتے تھے، اور میری آنکھیں اُن رنگوں سے اُبھرنے والی تصویروں کے لئے۔ وہ رنگ تمہارے ہاتھوں کا لمس اس لئے مانگتے تھے کہ دے وانٹڈ ٹو جسٹی نائی دیئر ایکس ٹنس۔ میں نے تمہاری رفاقت اس لئے چاہی تھی۔ کہ مجھے تمہاری تخالیق میں اپنے وجود کے معنی نظر آتے تھے، وہ معنی مجھے اپنی تخالیق میں بھی ملتے تھے، مگر تمہارے ساتھ مل کر وہ معنی بہت تنومند ہو جاتے تھے۔ ایک دن تم اپنی میز پر کام کرنے لگے تھے۔ تم نے ہاتھ میں برش لیا اور پاس پڑی شیشیوں کو کھولا۔ میرے ماتھے نے نہ جانے تم سے کیا کہہ دیا۔ تم نے ہاتھ کے برش پر تھوڑا سا رنگ لگا کر میرے ماتھے کو چھو دیا۔ نہ جانے وہ میرے ماتھے کا کیا خود غرض مطالبہ تھا۔ آج مجھے اُس کی سزا مل رہی ہے۔ آدم نے جیسے گیہوں کا دانہ یا سیب لیا تھا تو اُسے جنت سے نکال دیا گیا تھا۔۔۔۔۔

کل ایک روسی آرٹسٹ آیا تھا۔ اُس نے مجھے سامنے بٹھا کر ایک اسکیچ بنایا۔ اُن لمحوں کے درد کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ میں نے ایک نگاہ اُس اسکیچ کی طرف دیکھا تو میری آنکھیں بھر آئیں میری طرح وہ پنسل بھی ضرور روئی ہو گی کہ کاش! وہ تمہارے ہاتھوں میں ہوتی، صرف تمہارے ہاتھوں میں۔۔۔۔۔ فیض کو اُس بدنصیب عورت کا سلام کہنا، جس نے اُس کی سوانح حیات لکھی ہے۔

تمہارا خط ملا۔ جیتی دوست! میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ تمہاری رفاقت دوستی

کی حدود کو چھو گئی۔ دوستی محبت کی حد تک گئی، محبت عشق کی حد تک اور عشق جنون کی حد تک۔
اور جس نے یہ جنون کی حد دیکھی ہو وہ کبھی ناراض نہیں ہو سکتا۔

اگر یہ علیحدگی کوئی سزا ہے تو یہ سزا میرے لئے ہے۔ کیونکہ یہ راستہ خود تمہارا اختیار کیا ہوا ہے، تمہارا اپنا انتخاب۔ اس لئے یہ تمہارے لئے سزا نہیں ہے۔

یہ میں نے کبھی نہیں سوچا کہ تمہاری محبت پاک نہ تھی۔ لیکن اُس محبت میں ایک پیاس تھی۔ جوانی کی پیاس۔ اس پیاس کو تمہیں تسکین دینا ہی ہوگی، جیتی! میں اور تم دونوں اس پیاس کا بھیانک روپ دیکھ چکے ہیں۔ تم جیسے مجھ تڑپتی کو ایک پرائے گھر میں چھوڑ گئے تھے ـــــ یہ تمہارا روپ نہیں، تمہاری پیاس کا بھیانک روپ ہے۔

تم دس سال اس پیاس کو جی بھر کے بجھا لو۔ پھر تمہارے بدن پر پڑے سارے داغ میں اپنے ہونٹوں سے پونچھ ڈالوں گی اور اگر تم نے پھر بھی چاہا تو بس تمہارے ساتھ جینے کے لئے بھی تیار رہوں گی اور مرنے کے لئے بھی۔

امرتا جب پہلی بار ۲۳ اپریل ۱۹۶۱ء کو روس گئی تھی، وہ مجھ سے ناراض تھی۔ میں بمبئی سے اپنے شہر دہلی واپس تو آگیا، لیکن فضا ابھی سازگار نہیں ہوئی تھی۔ تاہم روس کو روانگی کے وقت میں نے امرتا کو موتیا کے پھول دیئے تھے۔ روس سے مجھے اُس کا صرف ایک خط ملا۔ اور پھر شاید اُسے اپنی ناراضی یاد آگئی اور اُس نے کوئی خط نہ لکھا۔ ذیل کا خط اُس کا روس سے لکھا وہی خط ہے:

جیتی!

زندگی نے جو بھی پل مجھے خوبصورت دیئے ہیں۔ میں ان کی شکر گزار ہوں۔ قیمتوں کی کوئی

؎ یہ بلونت گارگی کے گھر کا ذکر ہے، جہاں نومبر ۱۹۶۰ء میں کچھ دن رہ کر ہم الگ ہوئے تھے۔

پروا نہیں۔ تمہاری محبت کے کچھ پلوں کے لئے میں نے کتنی بڑی بغاوت کی قیمت دی ہے۔ تب بھی اُن پلوں کو مہنگا نہیں کہہ سکتی۔

یہاں آج بالکل پرائے دیس میں جس طرح پھولوں سے مجھ کو سجایا ہے رائٹرز یونین نے میری آمد سے قبل ایک مضمون شائع کیا تھا — "خوش آمدید ہماری دوست امرتا" اور زلیفہ نے جیسے مہمان نوازی کی ہے! میں نے کہا ہے، "کبھی میں نے ایک نظم لکھی تھی: "زندگی کی مہمان نوازی ہم دیکھ چکے"، لیکن آج زندگی نے میرا الہنا اُتار دیا اور جس وقت میں نے یہ بات کہی تھی، میرے بالوں میں تمہارے موتیا کے پھول لگے ہوئے تھے۔

تاشقند

۲۰-۴-۱۹۶۱ء

نومبر ۱۹۶۰ء سے دسمبر ۱۹۶۳ء تک امرتا مجھ سے ناراض رہی۔ اس کی ناراضی جائز تھی۔ ان تین سالوں کے دوران میں دلّی میں دھونی رماکر اپنا ہی چناب پار کرتا رہا۔ ہم ہر روز ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ نہ وہ میرے بغیر رہ سکتی تھی نہ میں اس کے بغیر۔ اُس نے ۱۹۶۱ء میں حوض خاص میں اپنا مکان بنوانا شروع کیا تھا۔ ہم دونوں یہ مکان بنتا دیکھتے رہے۔ مارچ ۱۹۶۲ء سے امرتا اپنے نئے مکان میں رہ رہی تھی۔ پھر ۸ جنوری ۱۹۶۴ء کو فاصلے کا یہ چناب ختم ہوا اور ہم اکٹھے رہنے لگے۔ لیکن اس کے پہلے سالوں میں اُس نے جو تنہائی برداشت کی، اُس زمانہ کا لکھا یہ خط ہے، ۲۹ مارچ ۱۹۶۲ء کا:

جیتی!

یہ میری زندگی کی سڑک کیسی ہے؟ جس کے سارے سنگ میل حادثوں سے بنے ہیں۔ تم پہلے تو گھر نہیں تھا۔ آج گھر ہے تو تم نہیں ہو۔ چند میلوں کا فاصلہ ہوتا ہے، لیکن ایک قانون

کی چھوٹی سی مہر اُسے دوسری دنیا کا فاصلہ بنا دیتی ہے۔

میں عجیب طرح سے پریشان ہوں۔ ایسے لگتا ہے، جیسے یہ پریشانی میری عمر کے برابر لمبی ہے، یا شاید عمر ہی کا دوسرا نام پریشانی ہے۔

—— آشی

۲۹-۳-۱۹۶۲ء

جب راجندر سنگھ بیدی "رانو" فلم بنا رہے تھے، ایک شام بمبئی میں امرتا کو فون آیا کہ وہ فلم کے لئے ایک گیت لکھ دے۔ وہ اس گیت کے صرف پانچ سو روپے دے رہے تھے۔ فون پر ہی گیت کی طرز بتائی گئی۔ امرتا نے گیت لکھا، دو دن بعد ڈاک سے بھیج دیا اور فون پر بھی لکھوا دیا۔ اس کے بعد گانے کی ریکارڈنگ بھی ہوئی یا نہیں، امرتا کو کچھ بھی معلوم نہیں۔ ہفتے بیت گئے، مہینے بیت گئے۔ نہ کوئی خط، نہ کوئی فون۔ گیت مل جانے کے بعد بیدی صاحب بھی چپ تھے اور ان کا اقرار بھی خاموش۔ میں ایک بار بمبئی گیا۔ سکھبیر کے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے سکھبیر سے پوچھا۔ "بولنے والے بیدی صاحب تو سنائی دیتے ہیں۔ لیکن یہ خاموش بیدی صاحب بھی کیا کسی کو سنائی دیتے ہیں؟" حالانکہ امرتا نے اُن کا وعدہ انہیں کبھی یاد نہ دلایا تھا۔ ذیل کے خط میں امرتا کا اشارہ اسی واقعہ کی طرف ہے:

آج نہ جانے کیا ہو گیا، جیتی! لگتا ہے، وقت رُک گیا ہے۔ صبح کے دس بجے ہیں۔ ابھی خط آئے گا۔ تب وقت چلنا شروع کر دے گا۔ اوتار آئی ہوئی ہے۔ کل رات اوتار، بیبلی، کندلا، اور میں نے فلم دیکھی تھی — "مائی فیئر لیڈی"، بہت جی چاہا، میں یہ فلم تمہارے ساتھ دیکھتی۔ جیتی! تمہاری فلم کبھی بنے یا نہ بنے، تمہاری پینٹنگز کی نمائش کبھی ہو یا نہ ہو، تمہارے

درون کا ہنر اور حسن سکرین یا کینوس پر اترے کہ لوگوں کے سامنے آئے یا نہ آئے، لیکن تمہارے دُرون کے حسُن اور ہنر کو میرا سلام ہمیشہ پہنچتا رہے گا۔

میرے واحد دوست! تمہارے سوا اس دنیا میں مجھے کسی نے نہیں جانا کسی کے نہ سمجھ پانے کا شکوہ نہیں، تمہارے سمجھ پانے کا اطمینان ہے) ابھی مجھے اوتار بتا رہی تھی کہ بیدی صاحب کا کہنا تھا کہ امرتا پیسوں سے پیار کرتی ہے، ہر شے کو پیسوں سے تولتی ہے۔ میری طرح تم بھی یہ بات سن کر ہنس دینا۔ لوگ کتنے سطحی ہوتے ہیں۔ میں بیدی کو اُن لوگوں میں شمار نہ کرتی تھی۔ خیال تھا کہ اُنہیں قلب انسانی سے گہری واقفیت ہے، اُن کی نظر الگ ہے، نظریہ مختلف ہے۔ لیکن ہے سب سطحی! کمائی کا فخر ابھی تک کسی نے نہیں جانا۔ لوگ خیرات میں یقین رکھتے ہیں، مفت خوری میں یقین رکھتے ہیں۔ یہ خیرات اور مفت خوری لوٗٹ کے بدلے ہوئے روپ ہیں، کمائی کی خوبصورتی نہیں۔ جنہیں کمائی کا فخر ہو، اُن کے لبوں پر یہ الفاظ نہیں آتے۔ محنت کی قیمت ادا کرنا اور وصول کرنا، دونوں باتیں ایک ہی صفت کی پیداوار ہیں۔ مگر کئی لوگوں کے ایقان یکطرفہ ہوتے ہیں۔ وصول کرنا تو اُنہیں ٹھیک لگتا ہے، لیکن ادا کرنا نہیں۔ دینا کے بجائے ادا کرنا کا جملہ میں نے الزاماً لکھا ہے، تاکہ "دینا" سے خیرات کی بو نہ آئے۔ خیرات سے بدبو آتی ہے، لیکن "کمائی" سے مہک کا احساس ہوتا ہے۔

تمہارے مہک بھرے ہاتھوں کا پیار!

تمہاری ـــــ ماجا

۲۷ ـ ۴ ـ ۱۹۶۵ء

۱۹۶۶ء میں امرتا کے بلغاریہ اور ماسکو سے لکھے خطوط:

جیتی!

گھر سے اور جانے پہچانے چہروں سے بچھڑ کر پہلا احساس ایک عجیب سے اکیلے

پن کا ہو رہا ہے۔ رات کو جیسے اوپر دیکھنے پر بادل دکھائی دیتے ہیں۔ اس وقت ہوائی جہاز کی کھڑکی سے نیچے دیکھنے پر بادل دکھائی دے رہے ہیں..... جیسے آسمان کو پھاڑ کر آدھا نیچے بچھا لیا ہو اور آدھا اوپر اوڑھ لیا ہو —— صرف جسم ہی نے نہیں، خیالوں نے بھی۔ ماسکو پہنچنے میں ابھی دو گھنٹے کی دیر ہے، خیالوں کو اکیلے پن سے چل کر کہیں پہنچنے میں ابھی نہ جانے کتنے گھنٹے باقی ہیں......

دو بجے دوپہر:

۲۴-۵-۱۹۶۶ء

میری گھڑی میں ہندوستان کا وقت ہے۔ چار بجے ہیں۔ ماسکو پہنچ گئی ہوں۔ یہاں ابھی دوپہر کے ایک بج کر پینتیس منٹ ہوئے ہیں۔ پاسپورٹ کی چیکنگ، سامان کا ٹکٹ، رات کے کھانے کا کوپن —— ایک گھنٹہ لگ گیا ہے۔ ابھی درشن کو فون کیا ہے۔ ایک ملک کے مہمان ہو کر آنے میں اور راہگیر ہو کر گزرنے میں کیا فرق ہے؟ بڑا دلچسپ تجربہ ہے!

لگ بھگ ایک گھنٹہ ایئرپورٹ پر گھومتے گھومتے تھک گئی ہوں۔ ابھی ایک کوپن ایئرپورٹ کے ریستوران میں جا کر استعمال کیا ہے (کل تین کوپن ملے ہیں) ہر کوپن میں ایک رُوبل اور تیس کوپکس کی چیز لے سکتی ہوں۔ ایک بیئر اور ایک انڈے کی قیمت قریباً مساوی ہے۔

رات گزارنے کے لئے ہوٹل کا کمرہ اچھا ہے۔ لیکن یہاں کھانے کا انتظام نہیں ہے کھانے کے لئے ایئرپورٹ کے ریستوران میں جانا ہوتا ہے۔ اس وقت یہاں کی گھڑیوں میں ساڑھے چار بجے ہیں۔ کمرہ کے بستر پر بیٹھ کر یہ خط لکھ رہی ہوں۔ اگر درشن ملنے آ گیا تو یہ خط پوسٹ کرنے کے لئے اُسے دے دوں گی۔

اس وقت رات کے نو بجے ہیں۔ لیکن ابھی تک دھوپ ہے۔ کبھی دھوپ کی طرف دیکھ رہی ہوں، کبھی گھڑی کی طرف۔ اس وقت درشن اور میں ایئر پورٹ کے ریستوران میں کافی پی رہے ہیں۔

....

۲۴-۵-۱۹۶۶ء

دوست! سوچ رہی ہوں، یہ طویل سفر اگر اکیلے ہی طے کرنا ہوں تو جوانی میں طے کر لینا چاہئیں، ورنہ ہمیں مل کر کرنا چاہئیں۔ عجیب سی تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ اکیلے پن۔ خیر! اکیلے پن کی بات کو طوالت نہیں دیتی، ورنہ خط لکھتے لکھتے پال پاٹس بن جاؤں گی۔

صوفیہ ہوٹل کے کمرہ میں بیٹھ کر یہ خط لکھ رہی ہوں۔ جس ہوٹل میں ٹھہری ہوں، وہ نیا بنا ہے بہت اچھا ہے۔ لیکن کھانے کا انتظام نہیں۔ کھانے کے لئے کسی اور ہوٹل میں جانا پڑتا ہے۔ صبح ہوائی جہاز میں چائے ملی تھی۔ لیکن آج سارا دن چائے نصیب نہیں ہوئی۔ شام کو کئی جگہ پتہ کیا۔ چائے نہ مل سکی۔ یہاں لوگ چائے نہیں پیتے۔ کندلا کی بنائی چائے یاد آ رہی ہے...

....

۲۵-۵-۱۹۶۶ء

صبح سویرے اٹھ کر سب سے پہلے چائے کا خیال آیا، اس طرح جیسے کندلا کو آواز دے دوں — "بھوپی! چائے پلا دے"۔ ساڑھے آٹھ بجے ایک ہوٹل میں جا کر چائے ملی۔ چائے کی پڑیا ایک پیالہ میں ڈال کر انھوں نے گرم پانی ڈال دیا۔ پڑیا کے کاغذ سے چھن کر چائے کا جتنا رنگ پانی میں آ سکتا تھا آ گیا۔ لیکن کہاں وہ یک آتشہ اور دو آتشہ چائے۔ میرا یہ خط ملے تو میرے نام پر کئی پیالے چائے پی لینا.....

۲۶-۵-۱۹۶۶ء

جیتی! او میرے جیتی!!

آج میں صوفیہ کے سب سے خوبصورت مقام پر بیٹھ کر تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ سارا شہر ایک سرسبز وادی ہے، جس کے چاروں طرف سبز پہاڑیوں کی موٹی جھالر لگی ہوئی ہے۔ بہت بلند جگہوں پر برف کی لکیریں گوٹے کی طرح چمک رہی ہیں۔ آج جہاں بیٹھ کر خط لکھ رہی ہوں، وہ وِتوشا پہاڑی کا ریستوران ہے —— صوفیہ شہر سے آدھ گھنٹہ کی ڈراپ یوں تو بسیں بھی ۴۵ منٹ میں آجاتی ہیں۔

پہاڑی راستوں کا ہر موڑ بڑا پراسرار ہوتا ہے —— جھرنوں اور پہاڑی نالوں کی آواز! اور جب پانی تن من کا زور لگا کر پتھروں سے گلے ملتا ہے، لگتا ہے، پانی نہیں، پتھر گا رہے ہیں سوچ رہی ہوں، اگر میری زندگی کے باقی ماندہ دن تمہارے ساتھ کسی ایسی پہاڑی کی کوکھ میں گزریں تو میں زندگی نہ گزاروں، بلکہ اُس کا پل پل جیوں، اُسے ایک ایک گھونٹ کر کے پیوں۔

آج تم مجھے بہت ہی یاد آ رہے ہو۔ اگر ان جگہوں پر تم میرے ساتھ ہوتے ! . . . . . . ایک لکڑی اور پتھر کی جھونپڑی میں، میں نے تمہارے اسٹوڈیو کا تصوّر کیا۔ پرسوں میں نے وہ ہاسٹل بھی دیکھا تھا، جہاں دوسرے دیسوں کے بچے پڑھتے ہیں۔ ایک بہت بڑے باغ میں بنا ہے۔ وہاں میں سیتی، کندلا کا تصوّر کر رہی تھی۔ اس وقت اس پہاڑی ریستوران میں ایک بہت بڑی میز پر بلغارین لڑکے لڑکیوں نے قبضہ جما لیا ہے۔ ایک بانسری جیسی کوئی چیز بجا رہا ہے، باقی گا رہے ہیں، کچھ ناچ رہے ہیں۔

کل صبح دہلی کے کچھ میوزی شنز یہاں سے واپس گئے ہیں اُن کے ہاتھ میں نے تمہیں ایک خط بھیجا ہے وہ دہلی جا کر پوسٹ کریں گے۔ جلد ہی تمہیں مل جائے گا۔ ٹیلیفون بھی کریں گے۔

میرے سیتی، کندلا کو بہت پیار۔

تمہاری —— ماجا

صوفیہ

۳۰-۵-۱۹۶۶ء

یہ دوسرا خط نور آج کو دے دینا:

ناجو!

یہاں سکوٹر عام ملتے ہیں۔ قیمت چار سو اور پانچ سو لیوا کے درمیان ہے۔ وارنا میں ریستورانوں کی تعمیر کے کئی نئے تجربے ہوئے ہیں —— بس پتھر اور شیشہ۔ تم جلدی جلدی ہندوستان کی تعلیم مکمل کر لو۔ پھر تمہارے لئے زندگی میں بہت کچھ ہے۔ جوانی کے لئے اور انٹلیکٹ کیلئے اس دنیا میں بہت کچھ ہے۔ یہاں قدامت کا عشق بھی عجیب قسم کا ہے۔ وارنا میں ایک جنگلی غار ہے۔ درختوں کے تنے کاٹ کاٹ کر بنائی میز کرسیاں اور پیڑوں پر سیڑھیاں لگا کر شاخوں پر بیٹھنے کے لئے بنی آرام گاہیں! ان آرام گاہوں میں ایک طرف رسیاں اور گراریاں لگی ہیں۔ رسّی نیچے لٹکا کر لوگ نیچے بنی بار سے شراب کے پیالے اوپر کھینچ لیتے ہیں اور پیڑوں کی چوٹیوں پر بیٹھ کر پیتے ہیں۔ بار میں کرسیوں کی جگہ جھولے پڑے ہیں۔ جھولوں میں بیٹھ کر لوگ شراب کا ایک ایک جام ہاتھوں لئے پیتے رہتے ہیں۔

تمہاری —— ماما

میرے امروز!

عاشق تو دنیا کے ہر ملک میں ہوتے ہیں۔ لیکن آج ماسکو میں عاشقوں کے عاشق دیکھ رہی ہوں۔ گورکی، چیخوف، ٹالسٹائی، پشکن، مایکافسکی اور کتنے ہی قلم کے عاشق اس ملک میں ہوئے ہیں۔ قلم کے، آزادی کے اور انسانیت کے عاشق دوسرے ملکوں میں بھی ہوتے ہیں، لیکن سوویٹ لوگوں نے جس طرح اُن کی چھوٹی سے چھوٹی یادوں کو بھی سمیٹ کر سر آنکھوں پر رکھ لیا ہے۔ انہیں عاشقوں کے عاشقوں سے کچھ کم نہیں کہا جاسکتا۔ ان کے ناموں پر بنی سڑکیں، ان کے بت اور ان کی تصویریں بنانے کے علاوہ ان کے قلم سے نکلی تصانیف، ان کے اعضاء سے لمس کئے لباس اور ان کے ہاتھوں سے چھوٹی اشیاء —— چاہے وہ ایک چاقو ہو، عینک ہو، کنگھی ہو، خط ہو یا چائے کی کیتلی اور ایک پیالہ ہی ہو۔

لوگوں نے چوم چوم کر رکھی ہوئی ہیں۔

لوگوں کی امارت اُن کے شگفتہ چہروں سے ہر جگہ صاف دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اُن کے ذخیرۂ نوادر میں جا کھڑے ہوں تو لوگوں کے دل کی امارت کی تھاہ نہیں ملتی۔ آج میں گورکی کی یادگار عمارت میں کھڑی لینن کے اعزاز اور دوستی کے حقدار مصنف گورکیؔ کی تصویر بھی دیکھ رہی ہوں اور طفل گورکی کے اُس گھر کا نقشہ بھی، جہاں اُس نے اپنے نانا کا پیار، غریبی اور مار جھیلی تھی اور اس دوران میں رونما ہونے والے ہر حادثہ کے نشان دیکھ رہی ہوں — وہ پہلی میز جس پہ کہنی رکھ کر گورکیؔ نے پہلی کہانی لکھی تھی، وہ اخبار جس میں اُس کی پہلی کہانی شائع ہوئی تھی۔ ۱۹۰۲ء میں گورکیؔ کے گھر کے سامنے لگائے زارؔ کے پہرے کی تصویر اور گولی سے چھدا چمڑے کا وہ ٹکڑا، جس نے دسمبر ۱۹۰۳ء میں جب زار کے آدمی نے اچانک گورکی کی چھاتی میں گولی ماری تھی۔ اس کی چھاتی کو بچا لیا تھا اور ۹ جنوری ۱۹۰۵ء کے اُس خونی اتوار کی تقریر، جب زارؔ کی گولی نے مزدوروں کی پُرامن ہڑتال کا سامنا کیا تھا اور گولی کا وہ غضب ناک مضمون جو اُس نے مزدوروں کی ہمدردی میں لکھا تھا اور جن کے بدلے میں زارؔ نے اُسے قید میں ڈال دیا تھا۔ گورکیؔ کی قیدی نمبر ۹-۶۸۹ اور جیل کی اُس لوہے کی چارپائی کا نقشہ میرے سامنے ہے، جس پہ بیٹھ کر گورکیؔ نے قلم سے کیا کچھ لکھ ڈالا تھا۔ گورکیؔ کی پچیس ہزار یادوں کی یہ عمارت اور اسی طرح ہر مصنف کی یادگاری عمارت کوئی ایسا ملک ہی بنا سکتا ہے، جہاں عاشقوں کے عاشق بستے ہوں۔

—— امرتا

۱۸-۶-۱۹۶۶ء

۱۹۶۷ء میں امرتا کے یوگوسلاویہ، ہنگری، رومانیہ، جرمنی اور طہران سے لکھے خطوط:

میرے جیتی!

اس بار یورپ کو دیکھنے پر جو تجربہ ہوا ہے، وہ بالکل نیا ہے، عجیب بھی، کل شام چھ بجے دبروونک پہنچی تھی۔ اُس وقت ہندوستان میں رات کے ساڑھے دس بجے ہوں گے۔ آدھا گھنٹہ ایئرپورٹ پر سامان لینے میں لگ گیا اور ایک گھنٹہ ہوٹل تک پہنچنے میں تھکاوٹ اور نیند سے بے حال سی تھی۔ جاتے ہی سو گئی۔ صبح اُٹھ کر چھ بجے ریستوران سے چائے منگوائی۔ ہوٹل عین ساحل سمندر پہ ہے، اس لئے برآمدہ میں بیٹھ کر چائے پی۔

ساڑھے نو بجے ایک لڑکی آئی۔ مجھے اپنے ساتھ دفتر لے گئی۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ وہ صرف ہوٹل کا کمرہ دیتے ہیں۔ کھانا اپنے پاس سے کھانا ہوتا ہے، جس کے لئے وہ روزانہ سات ہزار دینار دیتے ہیں۔ لیکن وہ کسی اچھے ہوٹل میں کھانا کھانے کے لئے کافی نہیں ہوتے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ میں بازار کے سستے ہوٹلوں میں کھانا کھا لیا کروں۔ یہ بازار میرے ہوسٹل سے کافی دُور ہے۔ ایک بیئر کی قیمت تین سو دینار ہے۔ سگریٹ کا پیکٹ بھی تین سو دینار میں ملتا ہے اور ایک امریکن سگریٹ کا پیکٹ ساڑھے آٹھ سو دینار میں.... ہوٹل واپس آکر پھر بازار جانے کی ہمت نہیں پڑ رہی، بہت گرمی ہے۔ شام کو ایک گائڈ آئے گا کچھ جگہیں دکھانے کے لئے، تبھی راستہ میں کچھ کھا لوں گی۔

یہاں ہر روز رات کو ساڑھے نو بجے ناٹک ہوتے ہیں۔ بہت ٹورسٹ آئے ہوتے ہیں۔ سارا دن بیرنگ سوٹ پہن کر ساحلِ سمندر پہ بیٹھے رہتے ہیں۔ مقام بہت خوبصورت ہے۔ لیکن میں بہت تنہائی محسوس کر رہی ہوں۔ یہاں ہر روز سارا دن اکیلی رہوں گی۔ صرف شام کو ساڑھے سات بجے کوئی آیا کرے گا۔ جس کے ساتھ ہر روز رات کو ایک ناٹک دیکھ لیا کروں (یہ دفتر کا بندوبست ہے) لیکن دن میں دو تین بار بازار جانا، گھومنا، کسی دکان پہ کچھ خرید کر کھانا۔

(اکیلے — اور جہاں کسی کو انگریزی نہیں آتی) بہت عجیب سا لگ رہا ہے.....

شام کے چھ بج گئے ہیں۔ بہت بھوک لگی ہے۔ کوئی ریستوران کھلا نہیں۔ سب سات بجے کے بعد کھلتے ہیں۔ ایک کیفے میں ایک گلاس بیئر اور ایک سینڈوچ خریدا۔ ۳۷۰ دینار ہیں۔ بیئر پی لی۔ لیکن سینڈوچ اتنا سخت تھا کہ کھایا نہ گیا۔ کنڈلا کی بنائی بھنڈیاں اور پنیر کی روٹی یاد آ رہی ہے.....

ایکسل سیئر ہوٹل — امرتا

۱۰-۸-۱۹۶۷ء

ابھی تم سے باتیں کر رہی تھی کہ جاگ گئی۔ چنانچہ اس بیداری کو درمیان سے ہٹاتے کے لئے یہ خط لکھ رہی ہوں۔ جیتی! اس بار عجیب سا تجربہ ہوا ہے۔ ایک لحاظ سے اچھا بھی ہے کہ اکیلے گھومتے ہیں لوگوں کو قریب سے دیکھ سکتی ہوں۔ بازار میں لوگ ہاتھ پکڑ پکڑ کر چیزیں خریدنے کے لئے کہتے ہیں۔ کل ایک عورت سرخ رنگ کے کاڑھے ہوتے تھیلے بیچ رہی تھی۔ گرد ہو گئی کہ ایک تھیلا ضرور خرید لو۔ بالکل معمولی تھیلا تھا۔ مجھے خریدنا تو نہیں تھا لیکن قیمت پوچھی — چھ ہزار دینار تھی۔

شہر کی چوڑی سنگین دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھے آرٹسٹ اپنی تصویریں دکھاتے ہیں۔ (خریدتا کوئی نہیں) بار بار تمہارا خیال آتا ہے۔ آرٹسٹوں کی زندگی کی جدوجہد ہر جگہ بڑی شدید ہے۔ عام لوگوں کو روزانہ قریباً دو ہزار دینار ملتے ہیں۔ لیکن اس سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا جا سکتا۔ شام کو میں نے ایک آملیٹ اور ایک سلائیس کھائی۔ ایک ہزار ایک سو دینار ہیں۔

بہت خوب ہوتا، اگر تم میرے ساتھ ہوتے۔ ہم خاموش سمندر کی جانب دیکھتے رہتے ہیں۔ برآمدہ میں کھڑی میں کبھی جہازوں کے بادبان دیکھنے لگتی ہوں اور کبھی کمرہ میں آ کر

ہنری ملر پڑھنے لگتی ہوں.........

Perhaps it is death instincts in me (The life instincts are converted into death instincts)

..... ایک احساس سا ہے کہ زندگی کے باقی دن بہت تھوڑے ہیں، پھر وہ تھوڑے سے دن بھی تمہارے بغیر کیوں؟

اس سے قبل تنہائی کو میں نے ہمیشہ کوئی سیال شے جیسا محسوس کیا ہے۔ بدن پر آتے پسینہ کی طرح، جسے رومال سے پونچھا جا سکتا ہے۔ اس طرح اس ٹھوس چیز جیسا کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ یہ اپنے ہی جسم پر ابھرے ہوئے گومڑے کی طرح ہے۔ جسے بار بار ہاتھوں سے ٹٹولا بھی جا سکتا ہے اور جس کا بوجھ بھی اُٹھا کر چلنا پڑتا ہے۔

—— ماجا

۱۱-۸-۱۹۶۷ء

جلیتی!

اِس بار تمھیں ذرا اُداس سا خط لکھ رہی ہوں۔ فون پر نگاہ جاتی ہے تو یک لخت تمہیں فون کرنے کو جی چاہتا ہے۔ دیوانگی ہے۔ اس دیوانگی کو پھاڑ کر مجھے باہر آجانا چاہیئے۔ ابھی عوامی رقص دیکھ کر آرہی ہوں۔ بہت خوبصورت تھے یہ ناچ، لیکن تم یاد آتے رہے اور..... کنڈلا بھی.....

۱۲ تاریخ، رات ساڑھے گیارہ بجے۔

تنہائی کے اتھاہ سمندر میں تمہارا خیال ایک لائٹ ہاؤس کی طرح آرہا ہے۔ لائٹ ہاؤس کی طرح بھی اور لائف بوٹ کی طرح بھی۔ اس وقت تم، ہنری ملر اور سمندر میرے پاس ہے

ہنری ملر اس طرح پڑھ رہی ہوں، جیسے اُس پر پی۔ایچ۔ڈی کرنا ہو۔۔۔۔۔ آج بہت بارش ہو رہی ہے۔ سمندر اور آسمان ایک ہو گئے لگتے ہیں۔

۱۳ تاریخ، صبح سویرے

مجھ پر تمہاری گرفت جیسی بھی ہے، نارمل نہیں ہے۔ ہنری ملر کے الفاظ میں —

Normality is the Paradise of — escapeologists for it is a flaxation concept, pure and simple. It is better, if we con, to stand feel quite normal about our abnormality, doing nothing, what ever abaut it, except when need to be done in order to be one self

اس ابنارملٹی کے بارے میں کچھ بھی نہیں کر سکتی، یہ میری ذات کا ایک حصّہ ہے۔ یہی میں ہوں۔

۱۳ تاریخ، دوپہر

یہاں کسی مصنف سے ملاقات نہیں ہو رہی۔ کسی کو انگریزی نہیں آتی۔۔۔۔۔

۱۳ تاریخ، شام

اس بار لگتا ہے، صرف تمہیں خط لکھنے کے لئے یہاں آئی تھی۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ ہر ایک سے باتیں کرنے سے بات ختم ہو جاتی ہے، صرف تمہارے ساتھ ہی بات آگے چلتی ہے، ایک سانس میں سے نکلنے والی دوسری سانس کی طرح۔۔۔۔۔

۱۴ تاریخ تڑکے — ماجا

جیتی!

حقیقتوں کی حدبندی سے گھبرا کر تلاش کی ہوئی ایک چیز ہوتی ہے — فین ٹیسی! لیکن سوچتی ہوں، جو سنجیدگی سے حاصل کیا جاتا ہے۔ وہ اس سے بھی پرے ہے۔ اس لئے تمہارا ذکر اُس سے آگے ہے — بیانڈ فین ٹیسی!

ہنری ملر کے الفاظ میں سارے آرٹ ایک دن ختم ہو جائیں گے۔ مگر آرٹسٹ ضرور رہیں گے اور زندگی 'ایک آرٹ' نہ ہوگی، 'آرٹ' ہوگی۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ہنری ملر کے تصوّر کا زمانہ ایک ہزار سال تک آئے گا تو میں یہ کہوں گی کہ وقت سے ایک ہزار سال پہلے پیدا ہو جانے میں تمہارا قصور ہے۔ یہ ہر اُس فرد کا قصور ہے جو سر سے پاؤں تک جیتا ہے۔ اس دنیا میں سبھی لوگ ایسے نہیں ہوتے۔ ہر فرد کا نصف جنم لیتا ہے، نصف ماں کی کوکھ میں ہی مر جاتا ہے۔ ہر فرد اپنا نصف ماں کی کوکھ کی قبر میں دفنا کر جنم لیتا ہے اور اُس کے لئے کسی مکمل انسان کو دیکھنے سے زیادہ اور کوئی بات رنج دہ نہیں ہوتی۔

تو اس دنیا کا تمہارے بارے میں لاپروا ہونا عین قدرتی ہے۔ یا یوں کہوں کہ ہر حال کی جڑیں صرف ماضی میں ہوتی ہیں۔ لیکن تم جیسے اُس شخص کا کیا کیا جائے، جس کے حال کی جڑیں مستقبل میں ہیں۔ اگر ایک ہزار سال بعد چھپنے والے کسی اخبار کی ایک کاپی بازار سے خرید سکوں۔ تو مجھے یقین ہے، میں اُس میں تمہارے کمرہ میں بند پڑے تمہارے فن پاروں کی تفصیل دیکھ سکتی ہوں۔ پرفیکشن جیسا لفظ میں تمہاری ذات کے ساتھ وابستہ نہ کروں گی۔ اس لفظ سے ایک سرد، ٹھوس سی شے کا احساس ہوتا ہے اور یہ احساس بھی کہ اس سے نہ کچھ گھٹایا جا سکتا ہے نہ اس میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن تم تو ایک ارتقا ہو، جس سے ہمیشہ کچھ نہ کچھ جھڑتا رہتا ہے۔ جس پر ہمیشہ کچھ نہ کچھ اُگتا رہتا ہے۔

پرفیکشن کا لفظ گرجا گھر کی دیوار پر لگی عیسیٰ کی تصویر کی طرح ہے۔ جس کے سامنے کھڑا ہونے سے بات کھڑی ہو جاتی ہے۔ لیکن تمہارے ساتھ بات کرنے سے بات چلتی ہے۔

بے اختیار، جیسے ایک سانس سے دوسری سانس نکلتی ہے۔ تم جیتی جاگتی ہڈیوں کے عیسیٰ ہو۔

ایک پرائے دیس سے تمہیں خط لکھتے وقت یاد آیا کہ آج ۱۵ اگست ہے، ہمارے دیس کی آزادی کا دن۔ اگر کوئی انسان کسی شے کی علامت بن سکتا ہے تو میں یہ کہنا چاہوں گی کہ تم میرے ۱۵ اگست ہو۔ میرے وجود اور میرے قلب کی آزادی کا دن۔

دوبرونک (یوگوسلاویہ) — امرتا

آج ۲۱ تاریخ تک شہر (دوبرونک) میں میرا آخری دن ہے۔ کل صبح نو بجے سے پہلے آخرد جانا ہے۔ وہاں سے مشت رہوں گا، جہاں شام شعر منائی جاتی ہے اور وہاں سے واپس بلگریڈ کتابوں کا بہت بوجھ ہے۔ لگتا ہے، دفتر والے زیادہ سامان کا کرایہ نہ دیں گے۔ اگر صبح وہ کرایہ دینا پڑا تو کھانا کھانے کے لئے پیسے نہ رہیں گے۔ اکیس دن کے پیسے وہ یک مشت دے چکے ہیں۔

آج ۲۲ تاریخ کو آخرد پہنچ گئی ہوں۔ کل شام جالی کا ایک تھیلا خرید کر سب کتابیں اس میں ڈال لیں۔ باقی بڑے پرس میں اور دونوں تھیلوں کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ باہوں میں درد ہو رہا ہے، مگر زیادہ سامان کے پیسے نہیں دینا پڑے۔ یہاں پلین میں پانی تک کو نہیں چھوتے۔ بہت طویل سفر تھا۔ آدھی جان ختم ہو گئی۔ لیکن یہاں پہنچ کر پھر جان میں جان آگئی ہے۔ یہ شہر آخرد ایک بڑی جھیل کے کنارے آباد ہے۔ قریباً ڈھائی سو شعرا کا اجتماع ہو رہا ہے۔ ۲۵-۲۶ اور ۲۷۔ تین دن نظموں کی شام منائی جائے گی۔ ابھی آتے ہی انہوں نے میری نظم انگریزی میں ٹائپ کر لی ہے — آگ کی بات، اس کا ترجمہ کرنے کے لئے۔ کتابوں کے بوجھ سے تھکی باہوں کو دبا رہی ہوں، مگر تھکان کامیاب ہے۔

'ناگ منی' کے ڈیزائن دیکھ دیکھ کر سبھی مسرور ہیں۔ حیران ہیں کہ ہندوستان میں بھی ایسے پرچے نکلتے ہیں اور رشک کرتے ہیں کہ اُن کی زبان میں کوئی ایسا پرچہ کیوں نہیں نکلتا!

تمہاری ——— ماجا

جیتی رہ جان!

آج شت روگا کے میلے میں نظم پڑھتے وقت لوگوں نے جو پیار دیا ہے۔ اُس سے آنکھیں چھلک آئی ہیں۔ پنجاب نے مجھے ساری عمر بے عزتی برداشت کرنے کی عادت ڈال دی ہے۔ اس لئے پرائے دیس میں اس نئی چیز کو پاکر بہت عجیب سا لگ رہا ہے۔

۲۶ — ۸ — ؟؟

یہاں سے ایک مضمون لکھ کر 'ناگ منی' کے لئے پوسٹ کر رہی ہوں نئے شمارہ میں شامل کر لینا۔ دوبرووننک میں بھی ایک آرٹیکل لکھا تھا لیکن وہ بیس صفحوں پر محیط تھا۔ اُس کی کاپی نہیں کی گئی۔ یہ دسمبر کے شمارہ میں، واپس آکر، چھاپ دوں گی۔

۲۷ - ۸ - ؟؟

جرمنی سے ان وی ٹیشن ملا ہے، ایک ہفتہ میں بلگریڈ پہنچ کر تاریخ طے کروں گی۔ ایک ان وی ٹیشن طہران سے بھی ملا ہے، تین دن کے لئے ہماری ایمبسی کے ذریعہ۔ صرف سوچتی ہوں، سفر بہت لمبا ہو جائے گا.....

۲۸ - ۸ - ؟؟

او میرے جیتی!

کل صبح سویرے ہی بلگمہ یڈ پہنچی تھی۔ اپنے پر تمہارے تین خط ملے — ایسے گویا یہاں ایئرپورٹ پر تم خود مجھے لینے آئے ہو۔ اس وقت تمہیں خط لکھ کر میں اپنی سالگرہ منا رہی ہوں۔

کل رات یہاں بوہی می ان گلی، دیکھی، یہاں شاعر، اداکار، مصور مل کر، انیسویں صدی کی روایات کے مطابق، ایک مہینہ کے لئے جشن منا رہے ہیں۔ رات کو دیواروں پر موم بتیاں جلا کر پینٹنگز بیچتے ہیں، انیسویں صدی کی خاموش فلمیں دیکھتے ہیں، پرانے ناٹک کھیلتے ہیں۔ ایک طرف کوئی مچھلی تل رہا ہے۔ یہاں وہ نظمیں بھی پڑھتے ہیں اور بھنے ہوتے کباب بھی کھاتے ہیں۔ کل رات انہوں نے مجھے بلایا تھا۔ کباب کھلائے اور میری نظمیں سنیں۔ ایک اداکار نے میری نظموں کا ترجمہ اس خوبصورتی سے پڑھا کہ وہ شام مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔

تمہاری — ماجا

۳۱—۸—۱۹۶۷ء

جیتی جان!

کل پہلی تاریخ کو دوپہر کے ایک بجے کے پلین سے ہنگری آگئی ہوں۔ ہنگری کی چمک دمک کے بعد، ہنگری کی قدیم اور وقت کے غبار سے میلی عمارتیں بہت خاموش اور اداس لگ رہی ہیں۔ لیکن کل شام پانچ بجے پی۔ ای۔ این مصنفوں کی ایک میٹنگ تھی۔ انہوں نے بلایا تھا۔ وہاں بہت سے مصنفوں سے ملاقات ہوئی۔ مسٹر ہُبا بھی، جو کسی زمانہ میں ہمارے گھر پہ دلّی میں ہم سے ملے تھے اور کئی شعرا بڑی یگانگت سے ملے۔

۳۱ تاریخ کو بلگمہ یڈ میں اچانک مجھے مشرقی افریقہ کے ایک شاعر زم بیری نے فون کیا۔ سالگرہ کی مبارکباد دی (یہ تاریخ اس نے بلیک روز، میں پڑھی تھی) اور ہوٹل کے رسیپشن روم

یں آکر بہت سے پھول دیئے۔ قلم کی امید بن، دیکھ لو، کہاں تک پہنچ جاتی ہیں۔

اُس دن دوپہر تک شاپنگ کی تھی۔ تمہارے لئے ایک ٹرانسسٹر اور ایک یوگوسلاویہ کڑھائی کی نیشنل قمیض خریدی۔ پستی کے لئے کچھ ریکارڈ اور کندلا کے لئے ایک جین اور ایک نیشنل کڑھائی کی جین ٹاپ۔ یہاں عجیب قیمتیں ہیں۔ ٹرانسسٹر بہت سستے ہیں (قمیض سے بھی سستے)

دوپہر سے لے کر رات تک بلگریڈ سے کوئی سوا سو کلومیٹر دُور اُس شہر گئی تھی۔ جہاں ۱۹۴۴ء میں جرمن فوج نے شہر کا ایک ایک ذی حیات (پورے سات ہزار) ایک ہی دن میں قتل کر دیا تھا۔ 'خون کی کہانی' عنوان کی نظم جو ہم نے 'ناگ منی' میں شائع کی تھی۔ اسی شہر کے بچوں کے بارے میں تھی۔ مرحوم بچوں کی یاد میں یہاں پتھر کے دو مروڑے ہوئے پر بنائے گئے ہیں۔ بچوں کی شکستہ پرواز کی علامت۔ یہ قریباً ۸ اگز چوڑی اور زمین سے ۱۰ اگز کی بلندی پر ہوا میں کھڑے ہیں۔ پتھروں پر بچوں کے چھوٹے چھوٹے چہرے کندہ ہیں۔ عجائب گھر میں اُن کی کچھ کاپیاں سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں۔ جن پر جیومیٹری کے کچھ سوال حل کئے ہوئے ہیں اور بچوں کے لکھے ہوئے ہیں —— دراگی، جماعت ہفتم، ثیبیا جماعت ششم...

سات ہزار مرحومین کی علامت کی صورت میں دو سفید بت بنائے گئے ہیں —— ایک مرد کا، ایک عورت کا۔ یہ صنم تراشی کے بے حد حسین نمونے ہیں۔ پتھر میں کرب کا فنی اظہار میں نے اس قدر حسین پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یوگوسلاویہ کی بت تراشی بہت ایڈوانسڈ لگتی ہے۔

کل صبح آنے سے پہلے بلگریڈ کا تصویر خانہ بھی دیکھا تھا، پکاسو کی پینٹنگز کی نمائش بھی۔ میکسی کن آرٹ کی نمائش بھی اُن دنوں وہاں ہو رہی تھی، وہ بھی دیکھی۔ یہ آرٹسٹ انسان اور جانوروں کی صورتوں کو کچھ عجیب طرح سے ملا کر پینٹ کرتا ہے۔ ہر جگہ تمہیں یاد کیا یہ سب چیزیں تمہارے دیکھنے کے قابل ہیں۔ یوگوسلاویہ کی ایک فنکارہ جرمنوں کے کنسنٹریشن

کیپ میں رہی تھی۔ہنوز زندہ ہے۔میں اُس سے مل نہیں سکی، وقت نہیں تھا، لیکن اُس کے بنائے بت دیکھے —— لوہے اور پتھر میں بناتی اُس کی سیلف پورٹریٹ بھی —— درد کی لوہے میں اتاری ہوئی تصویر!

یوگوسلاویہ کے لوگ (اُس شہر کے، جہاں جرمنوں نے سات ہزار لوگ مارے تھے) مجھے ۱۲ اکتوبر کو پھر بلا رہے ہیں، ایک ہفتہ کے لئے، اور وہ نظم پڑھنے کے لئے جو میں نے ،ناگ منی، میں شائع کی تھی (خون کی کہانی، کا ترجمہ) لیکن لوٹ کر جانا بہت کٹھن ہے خیر! دیکھوں گی.....

—— ماجا

میرے جلتی!

کل صبح ہوتے ہی تمہارا ۱۳ تاریخ کا لکھا ایسا خط ملا —— ایسا جو اگر ایک جنم میں نہ مل سکتا تو اُسے حاصل کرنے کے لئے دوسرا جنم بھی لیا جا سکتا —— تم میرے ۳۱ اگست بھی اور ہر برس کے ۳۶۵ دن بھی!

،ناگ منی، کا تازہ شمارہ ہنگری میں مل گیا۔یہ پہلی بار ہے کہ میں نے ،ناگ منی، کو ایک دور دیس میں بسنے والے قاری کی طرح ایک ایک صفحہ پلٹ کر دیکھا ہے۔ٹائٹل بہت ہی پیارا ہے۔صرف پروف کی غلطیاں بہت ہیں.....

آخر وسے میں نے ایک آرٹیکل بھیجا تھا، شت روگا میں ہوئے شاعروں کے میلے کے بارے میں۔وہ سنبھال کر رکھ لینا، ابھی مت شائع کرنا۔بلگریڈ میں بھی ایک آرٹیکل لکھا ہے۔یہ سب ایک ہی شمارہ میں شائع کریں گے، تصویروں کے ساتھ۔

میں یہاں سے ۲۳ تاریخ کو رومانیہ جاؤں گی۔وہاں سے اگلے مہینہ کی ۱۲ کو صوفیہ پھر ۲۰ تاریخ کو جرمنی۔

کل ۸ تاریخ کو یہاں سے ایک جھیل کے کنارے پر جانا تھا۔ وہاں کوئی آرام گاہ ہے۔
پہلی نظر میں ہنگری اُداس اور میلا دکھائی دیتا ہے لیکن یہ اپنے حسن کو دھیرے دھیرے
دکھاتا ہے، جلدی نہیں کرتا۔ رات کو جھیل کے کنارے بجلی کی روشنیوں سے جھلملاتا بوڈا
پسپٹ بہت خوبصورت لگتا ہے۔ یہاں مسٹر نیتھی کے ساتھ مل کر ہندی نظموں کا انگریزی میں
ترجمہ کرنے والے مشرا جی بھی آئے ہوئے ہیں۔ دو سال کے لئے امریکہ جا رہے ہیں۔ اس میرے
والے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں گنگا جل بھی ساتھ لائے ہیں۔ کل میں نے اپنی نظم کی ایک
سطر انہیں سُنائی تھی۔ گنگا جل سے لے کر ووڈکا تک وہ سفر نامہ ہے میری پیاس کا.....

تمہاری ـــــ ماجا

۷ - ۶ - ۱۹۶۷ء

آج صبح انڈین ایمبیسیڈر نے اپنے گھر بلایا تھا (کل ایئرپورٹ پر بھی کسی کو بھیجا تھا۔
گریٹ کرنے کے لئے) اس وقت میرے کمرہ میں دو ملکوں کے بڑے لال لال پھول سجے
ہوئے ہیں ـــــ ایک یوگوسلاویہ سے رخصت ہونے کے موقع کے دوسرے ہنگری میں استقبال کے۔ ہنگری میں
چائے اچھی نہیں ملتی۔ کافی اچھی ہے۔ لیکن چائے کڑوی بد ذائقہ اور چکنی سی۔ اس لئے
آج صبح انڈین ایمبیسی نے ہندوستانی چائے کا ایک بڑا پیکیٹ دیا۔

رومانیہ سے دعوت نامہ آگیا ہے۔ قریباً ۱۲ تاریخ کو رومانیہ جاؤں گی۔ ۱۵ اکتوبر
تک وہاں رہ کر پھر بلغاریہ اور پھر جرمنی جاؤں گی۔ راستہ میں کوئی تین دن طہران اور نومبر کے
پہلے ہفتہ میں واپس دلی پہنچ جاؤں گی۔

سچ، جینی! فاشزم کے معنی ہندوستان میں کسی کو سمجھ میں نہیں آسکتے۔ یورپ نے
اسے جھیلا ہے ابھی تک ہنگری میں شہروں کی دیواریں بموں کے دھوئیں سے کالی اور چھلی
ہوئی ہیں مرے ہوئے لوگوں کے صرف مانومینٹ رہ گئے ہیں یا کچھ تصویریں... کینڈی کو اور ناگی کو میرا پیار

تمہاری ـــ ماجا

میرے جلیتی!

تمہارے خطوں میں دگنی طاقت ہے — یہ مجھے وہاں بھی بلاتے ہیں اور یہاں بھی ٹھہراتے ہیں۔

سیکلی کا کبھی (برڑودہ سے) خط آیا ہے یا نہیں؟ کنڈلا بیٹیا بہت یاد آتی ہے ابھی میری انٹرپریٹر آئی ہے۔ دفتر سے تمہارا خط لے آئی ہے۔ تمہارا خط میرے ہونٹوں پہ تازہ سانس کی طرح آتا ہے.....

تمہاری — ماجا

۱۶—۹—۱۹۶۷ء

میری ناگی کے فنکار!

ہینگرین مصنف بہت اچھے لوگ ہیں، بڑے سادہ دل، پاک نظر، دنیا بھر کے ادب کو جاننے کے لئے پیاسے۔ تمہاری "ناگ منی" کے شمارے دیکھ دیکھ کر اُکتاتے نہیں۔ ہر روز باری باری اُن کے گھر جاتی ہوں۔ وہ ہر روز باری باری میرے ہوٹل میں آتے ہیں۔ میرا کمرہ سدا تازہ پھولوں سے مہکتا رہتا ہے۔ وہ لوگ اپنے ساتھ پھول ضرور لے کر آتے ہیں۔

دو ہینگرین شاعروں کی کتابیں اس وقت پنگوین سیریز میں چھپ رہی ہیں اب وہ تحریر میں نئے تجربوں کے لئے باؤلے ہو رہے ہیں۔ قریباً دس سال ان کے قلموں پر سخت پابندیاں رہی تھیں۔ وہ زمانہ انھوں نے سانس روک کر گزارا۔ اب ان کی تحریروں کو قبولیت مل رہی ہے۔ کل یہاں کا ایک شاعر مجھ سے صرف گنز برگ کی نظمیں سُننے کے لئے یہاں آیا تھا، جھوم رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب بھی یہ نظمیں اُن کے ملک میں کیوں نہیں چھپ رہیں۔

آج، ابھی، ہنگری سے رخصت ہونے کے دن، تمہارے تین خط ایک ساتھ ملے ہیں، ۶ تاریخ کا، ۱۲ کا اور ۱۳ کا۔ مجھے لگ رہا ہے، آج تم اور میں اکٹھے رومانیہ جا رہے ہیں۔

تمہاری ـــ ماجا

۲۲ ـ ۹ ـ ۱۹۶۷ء

کمال ہے جیتی!

رات کو ساڑھے دس بجے رومانیہ پہنچ گئی تھی۔ ایئر پورٹ پر انڈین ایمبیسی کی طرف سے بھی ایک گاڑی آئی ہوئی تھی۔ پیغام ملا، صبح کسی وقت میں ایمبیسی آؤں۔ صبح چائے پی کر گئی تو جاتے ہی تمہارے دو خط ملے، جیسے تم مجھ سے بھی پہلے مجھے لینے کے لئے رومانیہ پہنچ گئے تھے۔

تمہاری ذات ہر فاصلہ سے بے نیاز ہے۔ تمہاری ذات راستہ بھی ہے اور منزل بھی، حقیقت کی طرح وہ دھرتی پر ایک مقام پر بھی کھڑی ہے اور تصور کی طرح ہر مقام پر بھی ہر وسعت میں بھی۔ اس دنیا میں مجھے جہاں بھی، جو کچھ بھی اچھا لگ رہا ہے۔ وہ سب تمہاری ذات کے باعث۔ تمہاری ذات اس کا پس منظر ہے۔ تمہاری ذات اس کا افق ہے۔

ایمبیسی سے تمہارے خطوط لینے کے بعد، اپنی انٹرپریٹر کے ساتھ دفتر کی گاڑی میں گھوم کر شہر دیکھا۔ پانچ منزلوں، نو منزلوں، گیارہ منزلوں کا ہر ایک آمدہ پھولوں سے بھرا ہوا۔ چوک بتوں سے مزین۔ سڑکوں کے درمیان کی پٹڑیاں پھولوں سے سرخ، سبز خطوط کھینچ رہی ہیں۔ بہت خوبصورت شہر ہے۔ شہر میں نہ جانے کتنے باغات اور جھیلیں ہیں۔

ڈیڑھ بجے رائٹرز یونین کا دعوت نامہ ملا تھا ـــ تمہیں شاید زہریا سٹانکو کا نام

یاد ہو (جس کے ناول 'پیرفٹ' کے بارے میں بہت عرصہ ہوا، اپنے ایک مضمون میں اُن کا ذکر کیا تھا۔ وہ مجھے ایشیائی رائٹرز کانفرنس کے موقع پر دلّی میں ملے تھے) یہاں وہ یونین کے صدر ہیں۔ دوپہر کا کھانا اُن کے ساتھ کھانا تھا۔ کچھ رُوسی اہلِ قلم بھی یہاں آئے ہوئے تھے۔ دو بجے کھانا شروع ہوا۔ پانچ بجے ختم ہوا۔ بہت طویل اور شاعرانہ ٹوسٹ دیئے گئے۔ روسی مصنفوں کا ایک ٹوسٹ تھا" شاعری چونکہ مونث کا صیغہ ہے۔ اس لئے امرتا سے ملنے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاعری نے بھارت میں جنم لیا۔۔۔۔۔"

اور کئی ٹوسٹ تھے۔ میرا ٹوسٹ تھا۔" ہماری زبان میں 'ساقی'، کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے، جو جام بھرے (اُس وقت میزبان زہر یاستانکو ہم سب کے گلاسوں میں وائن ڈال رہے تھے) اِس لفظ کا اگر رومانیہ کی زبان میں ترجمہ کریں تو وہ ہوتا ہے — زہر یاستانکو!"

اور جان جیتی! میری زندگی کا سب سے بڑا ٹوسٹ تمہاری ذات کے نام!

نارو ہوٹل، بخارسٹ

۲۳ ستمبر ۱۹۶۷ء　　　　تمہاری — ماجا

جرمنی کا ٹکٹ آج دوپہر تک بھی انڈین ایمبیسی میں نہ پہنچا تھا۔ جرمن ایمبیسی نے بتایا کہ ٹکٹ وہاں سے بھیجا جا چکا ہے۔ انہوں نے کیبل دے کر ٹکٹ نمبر بھی معلوم کر لیا تھا۔ لیکن ٹکٹ کہیں سے بھی نہ مل رہا تھا۔ آخر ایک بڈھے رومانین نے بتایا کہ ہوائی جہاز کے دفتر میں پڑا ہے۔ یہاں لوگ بتاتے ہیں — ہمیں اگر ساٹھ دن کے بعد بھی اپنے دفتروں سے خط کا جواب مل جائے تو ہم اپنے کو خوش قسمت سمجھتے ہیں۔ یہ بھی سوشلزم ہے!

۱۲ اکتوبر ۱۹۶۷ء　　　　تمہاری — ماجا

میرے امروز!

آج میرے ہاتھ سے میرا قلم چھوٹ گیا — شاید آج وہ میرے چالیس لاکھ پنجابیوں کے گھروں میں جاکر اُن سے کچھ پوچھنے، انہیں کچھ بتانے چلا گیا ہے — آج میں رومانیہ کی اُس لائبریری میں بیٹھی تھی، جس کا نام ہے بی۔پی۔ٹی۔ یہ بِبلوتیکا پنترو توتاس کا اختصار ہے، اور اس کے معنی ہیں ہر انسان کی لائبریری۔

اس لائبریری میں پبلشرز ہر ہفتہ ایک کتاب شائع کرتے ہیں؛ ہر کتاب ۴۰۰ سے ۵۰۰ صفحات تک مشتمل ہوتی ہے، ہر کتاب کا پہلا ایڈیشن پچھتر ہزار کا ہوتا ہے اور ہر کتاب کے کئی ایڈیشن چھپتے ہیں — کسی کسی کے بیس ایڈیشن بھی۔

یہ ہر ہفتہ شائع ہونے والی کتاب کبھی کسی رومانین مصنف کی ہوتی ہے اور کبھی کسی غیر ملکی کتاب کا ترجمہ۔ لیکن یہ مکمل اشاعت کا ایک حصّہ ہے، ملکی اور غیر ملکی ادب کو شائع کرنے والا۔ اگر اس کے ساتھ ملکی اشاعت کو بھی ملا لیا جائے تو حساب بنتا ہے ہر ڈیڑھ دن بعد ایک کتاب کی اشاعت۔

۱۹۳۱ء کی بات ہے، ملک کے ایک عظیم شاعر کی ایک کتاب چھپی تھی۔ جس کا ایڈیشن صرف ۵۰۰ کاپیاں تھا۔ چودہ برس گزر جانے کے بعد کسی کو اُس کتاب کی ضرورت ہوئی۔ اُس نے خریدی تو معلوم ہوا کہ ابھی تک وہ ۵۰۰ کاپیاں بھی ساری فروخت نہیں ہوئیں۔ لیکن ۱۹۶۳ء آیا تو پھر کیسے لوگوں کو اُس کتاب کی تشنگی ہوئی! اُس سال اُس کتاب کا دوسرا ایڈیشن چھپا — چھ ہزار۔ اور چھپنے کے چوبیس گھنٹوں کے بعد اُس کتاب کی ایک کاپی بھی ملنا مشکل ہو گئی۔ پھر اُسی کتاب کا ایک اور ایڈیشن نکالنا پڑا — بیس ہزار۔ اور اب اُسی کتاب کا ایک ایڈیشن شائع ہوا ہے — اسی ہزار۔

یہ سب کچھ میرے خوابوں سے مختلف نہیں، مگر سمجھ سے پرے ضرور ہے۔ معلوم نہیں، ایسے خواب سمجھ سے پرے کیوں ہوتے ہیں......

۱۹۳۴ء میں بھی یہ خواب ہماری سمجھ سے باہر تھا۔۔۔۔ یہ لوگ کہتے ہیں اور بتلاتے ہیں، اب ہر رومانین پہلی کو تنخواہ لے کر پہلے کتابوں کی دکان پر جاتا ہے۔ اس سال کتابوں کی تعداد لوگوں کی مانگ پر پوری نہیں آ رہی۔ اس لئے اگلے سال سے ہم ہفتہ میں ایک کتاب نکالنے کے بجائے دو کتابیں شائع کیا کریں گے۔۔۔۔۔ (مہنگی کتابیں بھی چھپتی ہیں۔ اسی یا سولئی تک کی قیمت کی۔ لیکن اس ہفتہ وار چھپنے والی کتاب کی قیمت صرف پانچ لئی ہوتی ہے)

خواب سمجھ کی حدود کے اندر کس طرح آتے ہیں؟ شاید اپنے لوگوں سے یہی پوچھنے کے لئے آج میرا قلم میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے —— اور یہاں رومانیہ میں بیٹھے مجھے لگ رہا ہے کہ اس وقت وہ حیران و پریشان پنجاب کی گلیوں میں بھٹک رہا ہے۔۔۔۔

نارو ہوٹل، سنجارسٹ

۲۶ ستمبر، ۱۹۶۷ء تمہاری —— امرتا

یا اللہ! گوڑوں سے آگے بھی کچھ ہے؟ کہتے ہیں ایک بار برہم بھوج کی پوریوں اور کھیر سے لدی تھالیاں دیکھ کر ایک غیر ہندو کا من للچا گیا۔ اُس نے اُس بھوج میں شامل ہونا چاہا۔ ایک دوست نے صلاح دی کہ وہ دھوتی کرتا پہن کر چپ چاپ قطار میں بیٹھ جائے اگر کوئی پوچھے کہ وہ کون ہے تو کہہ دے کہ ہندو ہے۔ اگلا سوال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کونسا ہندو ہے، تو اُس نے یہ جواب بھی رٹ لیا کہ وہ گوڑ ہندو ہے۔ لیکن جب وہ قطار میں بیٹھ گیا تو اُس کے بیٹھنے کے انداز سے کسی کو شک ہو گیا۔ سوال کیا گیا۔ "بھئی، تم کون ہو؟" اُس نے جواب دیا۔ "میں ہندو ہوں" پھر دوسرا سوال ہوا۔ "کون ہندو؟" اُس نے رٹا ہوا جواب دیا۔ "گوڑ ہندو۔" جواب تسلی بخش نہ تھا۔ اس لئے سوال کیا گیا "کون گوڑ؟" وہ گھبرا گیا اور بے اختیار اُس کے منہ سے نکل گیا۔ "یا اللہ! گوڑوں سے آگے بھی کچھ ہے؟"

میرے امروز! کل رومانیہ کے اشاعت گھر میں جاکر ہر ڈیڑھ دن کے بعد ایک کتاب کی اشاعت کا جو معاملہ دیکھا تھا۔ آج معلوم ہوا کہ وہ تو صرف اشاعتی ادارہ کا حساب ہے۔ آج عالمگیر ادب کے اشاعت گھر میں جاکر دیکھا ہے۔ دو سو لاکھ کی آبادی کے اس چھوٹے سے ملک میں ہر سال آٹھ ہزار نئی کتابیں چھپتی ہیں، جن کی تعداد آٹھ سو لاکھ کاپیاں ہوتی ہے۔ فی کس چار کتابیں۔

یہ ساری اشاعت کئی عنوانوں میں منقسم ہے —— پوہزی (پوئٹری) ہم عصر اور غیر ہم عصر کلاسیکی ادب، جدید افسانہ، تاریخ، فنِ تمثیل، تحقیق، تنقید وغیرہ۔

دنیا بھر کے ادب کا انہوں نے اپنی زبان میں ترجمہ کر لیا ہے —— قریباً تیس کتابیں امریکی ادب سے، تیس لاطینی امریکہ کے ادب سے تیس سوویت ادب سے، تیس فرانسیسی ادب سے، پچیس انگریزی ادب سے، پندرہ جرمن ادب سے اور پندرہ اطالوی ادب سے۔ بھارتی ادب سے مہابھارت، رامائن اور اپنشدوں کے کچھ حصّوں کے علاوہ کالی داس اور ٹیگور کی کئی تصانیف شائع کی ہیں۔ آج کے ادب سے یہ لوگ پریم چند، آر کے نارائن، یشپال، رینو، شیو شنکر پلے، راجا راؤ اور راجندر یادو کی کچھ کتابیں شائع کر چکے ہیں کچھ کر رہے ہیں۔

دنیا بھر کے بارے میں ہر ملک کے خیالات، امریکہ میں انسانیت پرستی، تاریخ لاطینی ادب، شمالی امریکہ کے ادب کی تاریخ، جدید ادب کی تاریخ، وغیرہ جیسی مشکل اور مہنگی کتابیں بھی دس بارہ ہزار کی تعداد میں شائع ہوتی ہیں۔

یا اللہ! آج اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ چمڑے اور سلک کی جلدوں سے مجلّد کتابوں کو اپنے ہاتھ سے بار بار چھو رہی ہوں —— گویا ایک خواب کو چھو کر دیکھنے کی کوشش کر رہی ہوں!

بخارسٹ

۲۷ ستمبر ۱۹۶۷ء

تمہاری —— امرتا

پیارے امروز!

ایک پریشانی سی ہوئی ——— ۲۱ اکتوبر کو یوگوسلاویہ کے ایک شہر کراگویسے واچ میں جرمنی نے سات ہزار لوگ قتل کئے تھے۔ میں اگست کا مہینہ یوگوسلاویہ میں گزار آئی تھی، لیکن یوگوسلاویہ کے لوگوں نے ۲۱ اکتوبر کو مجھے پھر آنے کی دعوت دی تھی۔ تین سو مرحوم بچوں کی یاد میں یوگوسلاویہ شاعرہ ڈیسانکا میکسی موویچ نے جو نظم لکھی تھی، اُس کا پنجابی ترجمہ وہ اُس دن مجھ سے سننا چاہتے تھے۔ دیس دیس گھومتے ڈھائی مہینے ہو گئے ہیں، اس لئے اِس دعوت کو کسی اور سال پر ملتوی کر کے، میں یوگوسلاویہ جانے کے بجائے جرمنی آگئی ہوں۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ جرمنی پہنچنے کی تاریخ بھی وہی تھی ——— ۲۱ اکتوبر۔ مشرقی یورپ کے کئی ممالک دیکھے ہیں، لیکن مغربی یورپ میں آنے کا یہ پہلا موقع ہے اس لئے جانا چاہتی تھی۔ لیکن ایک عجیب بے چینی تھی ——— اس تاریخ کو وہاں نہ گئی، جہاں تین سو بچے مارے گئے تھے۔ وہاں آگئی ہوں، جہاں کی فوجوں نے اُن بچوں کو مارا تھا۔

اُسی تاریخ کو فرینک فرٹ میں ہائن رش باؤل کو جرمنی کا گیب روگ باشنز انعام ملا تھا۔ اُسی تقریب میں شامل ہونے کا دعوت نامہ مجھے بھیجا گیا تھا۔ شامل ہوئی۔ لیکن دل کا بہاؤ میرے ساتھ چلنے اور میرے ساتھ بیٹھنے سے منکر تھا اور پھر ہائن رش باؤل کی جوابی تقریر نے میری مدد کی: "یہاں آپ لوگ انسانی جذبات کی نمائندگی کرنے کے لئے میری عزت افزائی کر رہے ہیں، لیکن اس اعزاز سے مجھے مسرت نہیں ہو رہی۔ یہاں سے کچھ دور ویت نام پر بم برس رہے ہیں اور میں کچھ نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔"

سیاست کی دنیا اور ہوتی ہے اور انسانیت کی دنیا اور ——— یہ سوچ تو سکتی تھی، تاہم سب سے پہلے جس جرمن مصنف سے ملی، اُس سے پوچھا: "اُس زمانہ میں، ہٹلر کے دنوں میں مصنفوں کا کیا حال ہوا ہو گا؟"

تین باتیں ان کے سامنے تھیں: موت، جلاوطنی اور زبان بندی، چوتھی کوئی چیز

سامنے نہ تھی۔" جرمن ناول نگار، ڈرڈ گیجر مسکرایا اور کہنے لگا "صرف تب نہیں، اُس سے دس سال بعد بھی تین حالتیں تھیں۔ ایک حالت بالکل بے جان ہو جانے کی تھی، دوسری یہ بھی کبھی ہمت کو پھر سے ہڈیوں میں ڈال کہ زندہ رہنے کی کوشش کی اور تیسری دنیا سے منقطع ہوئے سلسلہ کو پھر سے جوڑنے کی کوشش میں یہ سوچنے کی کہ یہ سب کچھ کیسے اور کیوں ہوگیا۔"

"کارل مارکس یہاں پیدا ہوا تھا" تاریخی عمارتیں اور نقشے دکھاتے ہوئے بیرنڈ وادی نے کہا۔ "اُس سے بھی پہلے اُس کی تھیوری گیوبہک وانشر نے عوام تک پہنچائی تھی۔ وہ تیئس سال کی عمر میں مرگیا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو..." اور فرینک فرٹ میں گوئٹے کا گھر اور سٹوٹ گرٹ میں شلّلر کا مکان دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی "اس بستی نے اتنے فلسفی پیدا کئے، مگر..."

اور میری انٹرپریٹر سنڈلر نے مسکرا کر کہا "ہٹلر آسٹرین تھا۔ جرمن نہ تھا۔" ——— اور فرینک فرٹ میں وادی سکے کے الفاظ کانوں میں بلکنے لگے : "لیکن اس زمانہ کو معاف نہیں کیا جاسکتا اُسے عوام نے بھی جھیلا اور ادیبوں نے بھی" ہمارے فلسفی ایڈورنی نے کہا ہے : جس زبان کے بولنے والوں نے دنیا میں اتنا قتل کرایا ہے اس میں کوئی نظم یا کہانی نہیں لکھی جاسکتی..."

اب میں پریشان نہیں ہوں۔ ایک عجیب سی سوچ ہے، اس لئے کہہ سکتی ہوں، جس زبان میں یہ سوچ آسکتی ہے، یہ شعور آسکتا ہے، اُس میں تخلیق کیا، کچھ بھی آسکتا ہے...

سٹوٹ گرٹ

۲۶ اکتوبر ۱۹۶۷ء ——— امرتا

میرے امروز!

اس وقت رات کے گیارہ بجے ہیں۔ کل ٹھیک اسی وقت طہران پہنچ جاؤں گی ——— یہاں میونخ سے واپس پھر فرینک فرٹ، پھر یہاں سے طہران کی سیدھی فلائٹ مل جائے گی۔

یہ میونخ جرمنی کے جنوب میں صوبہ بیویریہ کا سب سے بڑا اور خوبصورت شہر ہے ہٹلر کا گڑھ بھی اسی شہر میں ہوا تھا۔ یہاں کے لوگ ہٹلر کا نام نہیں لیتے۔ اُس کے بارے میں کہنا ہو تو مسٹر ایچ، کہہ کر بات آگے بڑھا دیتے ہیں۔ یہ جنوب کے لوگ شمال کے لوگوں سے بالکل مختلف طبیعت کے ہیں۔ ان کا مزاج زندہ، سادہ اور ملنسار ہے۔ شمالی علاقوں کے لوگوں کو یہ اپنے ساتھ ملا نہیں سکتے۔ میری آج کی شام جرمن لوک گیتوں سے بھیگی ہوئی تھی۔ سات بجے سے پونے گیارہ بجے تک۔ کونیاک میں بھیگے ہوئے پھول لاتی رہی اور گیتوں میں بھیگی ہوئی شام کو دیکھتی رہی۔ ان میں ایک گیت تھا ——

آج بیویریا میں پردیسی آئے ہیں
امریکہ سے آئے ہیں، فرانس سے آئے ہیں، برلن سے آئے ہیں . . .

لہٰذا برلن سے آئے لوگ بھی ان لوگوں کے لئے امریکہ یا فرانس سے آئے لوگوں کی طرح غیر ملکی ہوتے ہیں۔

جس ریستوران میں بیٹھی یہ گیت سن رہی تھی، وہ خاص دیہاتی ماحول کا ریستوران تھا۔ یہاں گائے کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی موسیقی سنائی جاتی ہے اور قومی لباس میں ملبوس لڑکیوں کا رقص دکھا کر، درمیان میں عجیب عجیب مذاق چلتے ہیں۔ لوگ لڑکی کی صراحی سے شراب پیتے ہیں، سفید سا سے جک اور کونیک میں بھیگے پھل کھاتے ہیں، تالیوں اور سیٹیوں کے درمیان، لوک گیتوں کے کچھ بول دہراتے ہوئے ایکٹروں کا ساتھ دیتے ہیں (کبھی کبھی بیرے ہر ایک کو کاغذ کی مونچھیں دے جاتے ہیں۔ لوگ یہ مونچھیں ناک کے اوپر چپکا لیتے ہیں اور ایکٹروں میں شامل ہو جاتے ہیں)

آغاز بہت سنجیدہ تھا، سادہ لوک گیتوں سے:

شہر کی دیوار کے باہر ایک پیڑ ہے
اس پیڑ تلے میں نے بہت سے گیت بنائے تھے۔

اور اس پیڑ کے نیچے میں نے کئی خواب دیکھے تھے۔
برف سے بھیگی ہوا بہہ رہی ہے۔
میرے سر کا پلّو اڑ گیا ہے۔
کہیں چین نہیں، لیکن لوگ کہتے ہیں۔
بہت دور ایک پیڑ ہے۔ وہیں چین ملتا ہے۔
میں سوچتا ہوں، جو بھی پہنچ سے پرے ہے، وہی خوبصورت ہے....

پھر یہ گیت ہلکے ہوتے گئے:

دونوں لڑکیاں خوبصورت ہیں
لیکن ایک زیادہ حسین ہے
خیر! میں تو دوسری سے شادی کروں گا
کیونکہ اُس کے گھر میں پانچ گائیں زیادہ ہیں

اور پھر یہ لوگ ٹھٹول کرنے لگے۔ کچھ بھی ہو، عوامی جمہوریت کے ممالک میں تحریر و تقریر کی جو آزادی ہے، اُس کی مثال نہیں ملتی۔ مذاق کچھ اس طرح کے تھے:

ہماری بڑا مول کے کرائے بڑھ گئے ہیں
ہمارا میئر کبھی کبھی اپنی کار کو چھوڑ کر،
اشتہار بازی کی خاطر ٹرام میں جاتا ہے۔
پچھلی بار اُس نے ٹکٹ نہیں لیا
میں بھی میئر کی طرح ٹکٹ نہیں لوں گا

اس بار ہمارا چانسلر انتخاب میں جیت نہ سکا
خیر! کوئی بات نہیں

اب وہ امریکہ جائے گا
اور جانسن کا بیرا بن جائے گا

ہمارا فنانس منسٹر آجکل کیا کر رہا ہے
بہت مصروف ہے وہ
شاہ ایران کو اور اُدھار دینے کے لئے
وہ روپیہ جمع کر رہا ہے

اگر روسی اور امریکی لوگ کبھی خلا میں ملے
تو وہاں کوئی انٹرپریٹر نہ ہوگا!
وہ باتیں کیسے کریں گے؟
بڑی سیدھی سی بات ہے ——— وہ دونوں جرمن زبان میں باتیں کرینگے

میں من چاہے نغمے لکھتا ہوں، اور نت نئے گیت بناتا ہوں
میں اپنے ملک کے وزیر اعظم کی طرح غلام نہیں ہوں
وہ اپنی تقریر پہلے کاغذ پر لکھتا ہے
اور پھر کاغذ کو دیکھ کر بولتا ہے۔
وہ ایک سطر بھی پڑھ نہیں سکتا
لیکن میں اپنے گیتوں میں نت نئی سطروں کا اضافہ کرتا ہوں۔

کل دوپہر تک ایک کانسنٹریشن کیمپ دیکھا ——— شہر سے قریباً بیس کلومیٹر دور، اتنی خوفناک

خاموشی سے ٹوٹا ہوا، خاموشی کا ایک حصّہ
کرن سے ٹوٹا ہوا، کرن کا ایک حصّہ
یہ ایک کوئی وہ ہے، جو بہت بار بلانے پر بھی نہ آیا تھا
اور اب میں اکیلی نہیں، اب میں اپنے ساتھ کھڑی ہوں
شیشے کی صراحی ہیں، میں نے نگاہوں کی شراب بھری ہے
اور، ہم دونوں جام پی رہے ہیں
وہ ٹوسٹ دے رہا ہے — اُن الفاظ میں
جو صرف سینے میں اُگتے ہیں۔
یہ معانی کا جشن ہے —
میں ہوں، وہ ہے، اور شیشے کی صراحی میں نگاہوں کی شراب ہے۔

ابھی میں نے کہا تھا کہ اس نظم کو ایک بار خود ہی پڑھنا اور خود ہی سُننا چاہتی ہوں۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ تم تک اُس طرح نہیں پہنچ سکتی، جس طرح مجھ تک پہنچ سکتی ہے صرف یہ کہ اس وقت اسے کسی تک بھی پہنچانے کی مجھے ضرورت نہیں، خود اپنے تک بھی نہیں۔ اِسے اس وقت صرف اپنے سے اپنے تک رکھنا چاہتی ہوں — میں سے میں تک۔ تمہیں خط لکھ رہی ہوں، نظم بھی، صرف اس لئے کہ اس 'میں'، جو اس آج کی صورت میں ہے وہ صورت دینے میں تمہارا بھی حصّہ ہے۔

بہت عرصہ پہلے کے 'میں'، کے پاس، سوچتی ہوں، بہت کچھ نہیں تھا، صرف باقی ماندہ زندگی کے بہت سے سال تھے۔ لیکن آج کے 'میں'، کے پاس بقایا زندگی کے بہت کم سال رہ گئے ہیں، لیکن اور بہت کچھ بڑھ گیا ہے اس آج کے 'میں'، کے پاس جس شے کا اضافہ ہوا ہے، اُس میں بیشتر کا کارن تمہاری ذات ہے نظم تو اب بھی میرے دوست! میں سے میں تک ہی رہی ہے — آئی تھینک یو فار وٹ یو آر!

تمہاری — امرتا

طہران
۲ نومبر ۱۹۶۷ء

روزی روٹی کے لئے مجھے دلّی چھوڑ کر کئی بار بمبئی جانا پڑتا ہے، جو خود ایک طرح کا بن باس ہوتا ہے۔ میں وہاں بمبئی میں اکیلا رہ جاتا ہوں، امرتا یہاں دلّی میں۔ ذیل کے خطوط اُنہی دنوں کے ہیں:

میں بن باس میں شامل ہوں۔ اپنے جیتی کے بن باس میں دلّی میں رہ کر بھی شامل ہوں۔
ابھی جاپان کے ایک ناول میں جملہ پڑھا ہے:

یہ جملہ گویا ہو بہو تمہاری حالت کا غماز ہے۔ اپنی قوت کی قیمت ہمیشہ تنہائی سے ادا کرنا پڑتی ہے۔ لیکن غنیمت ہے کہ اب تمہاری تنہائی میں میری تنہائی شامل ہے اور میری تنہائی میں تمہاری تنہائی بھی۔ خاموشی سے ٹوٹے ہوئے خاموشی کے ایک ٹکڑے کی طرح۔ کرن سے ٹوٹے ہوئے کرن کے ایک ٹکڑے کی طرح۔

آج بوندا باندی ہو رہی ہے۔ اس لئے شاید ڈاک خانہ جایا نہ جائے ایک دو دن میں کچھ روپے منی آرڈر کروا دوں گی۔

کل شام چیکو سلوواکیہ کے دو مصنف آئے تھے، ناگ منی، کا ہر شمارہ بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ہر شمارہ کے ڈیزائن کی جب بات کرتے، لگتا، جیسے ہر فقرہ میں تمہاری بات کر رہے ہوں۔

میں تم میں شامل ہوں۔ لیکن جب تمہارے فن کی بات چلتی ہے، میں اس فن کو سلام کرنے کے لئے کچھ فاصلہ پر کھڑی ہو جایا کرتی ہوں۔

تمہاری —— ماجا

۲۷ - ۱۱ - ۱۹۶۷ء

کے پیٹ سے سٹا ہوا حصہ، اتار کر الگ پلیٹ میں ڈالا ہوا تھا۔ اور اُس کے نام نے، گویا دھیرے سے مُسکرا کر مجھ سے پوچھا ''اگر تم اپنی نظموں میں سے کسی نظم کو 'بِنّہ دیگ'، کہہ سکو، تو وہ کون سی نظم ہو گی؟''

جواب گویا سوال کے اندر ہی موجود تھا، کہیں باہر نہیں تھا۔ گٹار کے تاروں میں خوابیدہ جھنکار کی طرح۔ صرف اُن پر انگلی رکھنے کی کسر تھی۔ ٹوسٹ .... ٹوسٹ.....

میری وہ نظم ہے جو میری 'بِنّہ دیگ'، ہے۔

آج کچھ اور نظمیں پڑھنے کے بعد یہ نظم پڑھی تھی، پھر اس کے بعد کچھ نہیں۔ پھر تو میں کچھ پڑھ ہی نہ سکتی تھی۔

اگر کچھ پڑھ سکتی، تو پھر سے اِسے ہی پڑھتی ـــــ کیونکہ پھر سے صرف اِسے ہی سُن سکتی تھی ـــــ لیکن اپنے خوابوں کا بوجھ دوسروں کی سماعت پر نہیں ڈال سکتی، اس لئے کچھ اور نہ پڑھا۔

اب سونے سے پہلے اسے ایک بار میں خود ہی پڑھنا اور خود ہی سننا چاہتی ہوں۔ اس لئے تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ نظم بھی سن لو:

میں نے کل رات شیشے کی صراحی میں ـــــ
خیالوں کی شراب بھری تھی۔
خیال بڑے سُرخ تھے
دوستوں نے جام پیے تھے
اور اُن الفاظ کے ٹوسٹ دیتے تھے
جو سینے میں نہیں اُگتے
وہ کون سے پیڑ پہ اُگتے ہیں؟
اور ہونٹوں کے گملے میں کیسے آتے ہیں؟

یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔
یا یوں کہوں کہ سوچنے سے ڈر لگتا تھا
یہ الفاظ کا جشن تھا
فراموشیوں کی سالگرہ
میں تھی، رات تھی، خیالوں کی شراب تھی اور کئی دوست
دوست، جن میں کچھ دعوت پر آئے تھے اور کچھ بن بلائے
صرف ایک کوئی 'وہ' تھا
جو کئی بار بلانے پر بھی نہ آیا تھا

ابھی صبح ہوئی ہے
اور ابھی میں نے ایک گھنا جنگل دیکھا ہے
غرضوں کے پیڑ دیکھے ہیں
اور اُن پر آئی عجیب سی خزاں بھی دیکھی ہے
خزاں جو الفاظ پر نہیں، صرف معانی پر آتی ہے
دوستوں کے الفاظ اب بھی گلابی ہیں
بہار کے پھولوں کی طرح
صرف معانی جھڑتے دیکھ رہی ہوں۔
اور گھنے جنگل میں، میں بالکل یکہ و تنہا ہوں
میں ہوں، ایک کرن ہے اور شیشے کی خالی صراحی ہے
یہ کیسی خاموشی ہے، جس میں پاؤں کی چاپ بھی شامل ہے
کوئی دبے پاؤں آیا ہے

بات پہلے کبھی نہ ہوئی ہوگی — اسی دہاؤ کیمپ میں ۲۹ اپریل ۱۹۴۵ء کو — بتیس ہزار تین سو پینتیس یہودی ...... یہ صرف ایک کیمپ کی بات ہے۔ اس جیسے کئی کیمپ، کئی جگہوں پر — لیکن صرف یہی نہیں، آج جرمن لوگوں کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا، یہ سب کچھ کیسے ہوا تھا، کیوں ہوا تھا ...... کچھ اور لوگ بھی وہاں گئے تھے۔ جرمن لڑکیوں کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ ایک جرمن لڑکی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھنے لگی "آپ کا خیال ہے۔ ہم لوگوں نے یہ جو کچھ کیا، کبھی ہمیں اس کی سزا بھگتنا ہوگی؟"

آج وہی ملک ہے، مگر خیالات کے ایک مختلف موڑ پہ کھڑا ہے۔ شہر میں جگہ جگہ بڑے بڑے پوسٹر لگے ہیں: "ویت نام میں جانسن کی پالیسی کا حامی انسانیت کے قاتلوں میں شامل ہے۔"

وہ قوم قوتِ انسانی کو جو کبھی ہمیشہ اور ہر جگہ زندگی کی تعمیر کے لئے استعمال کی جاسکے۔ یہ ایک تاریخی سوال ہے۔ کسی ملک کے فلسفہ نے زندگی سے الگ رہ کر اس کا جواب پانا چاہا ہے اور کسی فلسفے نے زندگی کی ہر سطح کو کھول کر۔ لیکن ابھی فلسفے بھی بھٹک رہے ہیں اور قلم بھی۔ اس تلاش میں کبھی مغرب مشرق کی طرف بھاگتا ہے اور کبھی مشرق مغرب کی طرف۔ یہ ہر ملک کا سوال ہے — لیکن جہاں جتنی زیادہ شعوری بیداری ہے۔ وہ اُس کی ہمت کے تناسب سے ہے۔ جرمنی کے بارے میں ایک بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ عامۃ الناس میں بھی یہ شعور بہت شدید ہے۔ میری گائڈ لڑکی بڑی خوبصورت اور غور و فکر کی عادی ہے۔ میرے قریب کھڑی ہو کر اُس نے جب اپنی بڑی بڑی اور گہری آنکھوں سے ویت نام کے زخموں سے بھرے پوسٹر کو دیکھا اور اس کی آنکھیں ایک گہری ہمدردی میں نم ہو گئیں! مجھے لگا، پوسٹر کا ہر حرف کچھ اور ہو گیا ہے ......

میونخ

۲۸ اکتوبر ۱۹۶۷ء   تمہاری — امرتا

پسِ امروز! کبھی کسی نظم کو پڑھ کر یوں لگتا ہے، جیسے کوئی اپنی نظم دیکھ رہا ہو۔ یہ کسی ایک نظم کی بات نہیں۔ نظمیں کئی ہوتی ہیں اور کئی ایک اپنے ہی ہاتھ، پاؤں، بازو، کان، ناک چھونے کے برابر بھی، لیکن بازو کی نبض دیکھنے کے برابر، صرف ایک نظم ہوتی ہے کسی اور کے بارے نہیں کہہ سکتی، لیکن مجھے تو ایسے ہی لگتا ہے۔۔۔۔۔

طہران میں آباد جن پنجابیوں نے مجھے یورپ سے گھر لوٹتے کو کچھ دنوں کے لئے یہاں بلایا ہے۔ انہوں نے آج شام نظمیں سننے کی آرزو کی۔ سنانا تھیں، اس لئے سنائیں۔ اس سے پیشتر، کسی ایک کے سوا، کسی نے میرا کچھ نہ پڑھا تھا۔ نام ہی سن رکھا تھا۔ اس لئے بلا لیا تھا۔ آج نظم خوانی سے پیشتر بھی اور دوران میں بھی لگ رہا تھا کہ سب کچھ خود ہی کہنا اور خود ہی سننا ہے۔ لیکن پڑھے جا رہی تھی اور وہ بھی وہ نظمیں جو میں خود سننا چاہتی تھی۔ اگر خود ہی سننا تھیں تو صرف وہ کیوں نہ۔ جو خود سننا چاہتی تھی۔۔۔۔۔

نظمیں پانچ چھ تھیں، لیکن ایک نظم پڑھتے ہوئے لگا جیسے میں اپنے بازو پر اپنے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں رکھ کر اپنی نبض دیکھ رہی ہوں۔۔۔۔۔

یہ اچانک نہیں لگا، کل ہی سے معلوم تھا۔ کل یہاں ایک ایرانی امیر کے ہاں دعوت تھی۔ شاہ ایران کی تاجپوشی کے سلسلہ میں کئی روز سے یہ دعوتیں ہو رہی ہیں۔ دعوت ایک ایسے گھر میں ہو رہی تھی۔ جہاں موسیقی سے عشق کی روائت ایرانی غالیچوں کی طرح بچھی ہے۔ ادب و آداب کا ایک خاص ماحول تھا۔ گٹار کے (کانپتے ہوئے نہ کہوں گی) کے مرتعش سُر تھے اور پھر وہاں عینی بھی مل گئی ــــ قرۃ العین حیدر۔ اُس کی سروسی دوستی مجھے ہمیشہ اچھی لگتی ہے، برف میں لگی وسکی کی طرح۔ اور اس سب کچھ کے امتزاج سے میرے اندر ایک عجیب سا اطمینان پیدا ہو گیا تھا ــــ ایسا اطمینان جو شراب کے جرعہ کی طرح طلب بھی پیدا کرتا ہے اور خمار بھی دیتا ہے اور پھر میز پر آنے والے کھانے میں اور چیزوں کے علاوہ ایک چیز آئی ــــ تہِ دیگ۔ پلاؤ الگ رکابی میں، لیکن اُس کا نچلا حصّہ، دیگ

"ہائے اور ربا! نہیوں لگدا دل میرا۔۔۔۔" ریشماں کے گلے سے نکل کر میری آواز صحرا میں گھوم رہی ہے۔۔۔۔ اگر تمہارا شہر بھی اسی صحرا میں ہے تو تم نے ضرور سنی ہو گی۔
"کالا گلاب" کے پہر دو نہ میرے سامنے پڑے ہیں۔ صحرا میں بھٹکتی میری آواز کی تاریخ۔ ساری تاریخ نہیں، صرف کچھ ابواب۔ آئندہ ابواب، ان لکھے، تمہارے پاس ہیں، میرے پاس اور ریشماں کے پاس۔

تمہاری ——— امرتا

۸-۲-۱۹۶۸ء

ایما! اس بار برش میں ہولی کا رنگ بھر کر لے آنا۔۔۔۔ ہمارے سفید ہاتھوں کی قسم۔۔۔۔

۹-۲-۱۹۶۸ء ——— ماجا

جان جیتی!

تمہارے بہت پیارے خط ملے۔ اتنے پیارے کہ زندگی میں ایمان پیدا ہو جائے۔ اس قدم پر، زندگی سے ایمان ختم کر دینے والی دنیا میں تم، تمہاری ذات، تمہارے خطوط زندگی کی رحمت ہیں۔ ورنہ دنیا کے ظلم کی کہانی کتنی طویل ہے، یہ میں بھی جانتی ہوں اور تم بھی۔

آج لینگویج ڈیپارٹمنٹ پٹیالہ کا میری کتاب کے لئے بھجوایا ایک سو پچیس روپیہ کا چیک ملا۔ جو اُن کے الفاظ میں 'انعام' ہے ——— میرے الفاظ میں حماقت۔ یہ حماقت میز پر نہ رکھ سکی، اس لئے پچھتر پیسے جیب سے صرف کر کے بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ چیک لوٹا دیا ہے۔ اب کمرہ صاف ستھرا لگ رہا ہے۔ اب یہاں صرف تمہارے خطوط ہیں اور میری نظمیں۔

کل شام دیوندر سکرین لے آیا تھا۔ دُور ہی سے میری آنکھوں نے تمہارے ڈیزائن کو پہچان لیا۔

۶-۴-۱۹۶۸ء ——ماجا

ہم دیوانوں کی کیا بات ہے —— دوپہر کو سوئی تھی کہ دروازہ پر دستک ہوئی۔ آنکھ کھل سی گئی۔ لیکن یہ سوچ کر پھر سو گئی کہ جیتی خود دروازہ کھول دے گا۔ دروازہ پر پھر دستک ہوئی۔ پھر جاگ گئی — سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جیتی دروازہ کیوں نہیں کھولتا۔ اُٹھی اور تمہارے کمرہ کی جانب تم سے یہ کہنے کے لئے گئی کہ جیتی! دروازہ کیوں نہیں کھولتے؟ تو کمرہ خالی تھا۔ کتنی ہی دیر کے بعد ہوش آیا کہ جیتی تو بمبئی میں ہے۔

۵ تاریخ دوپہر کو کندلا[1] آ گئی، تین چار چھٹیاں لے کر۔ یوں تو وہ ۱۹ تاریخ کو آنے والی تھی۔ خط پڑھ کر آ گئی کہ ماما اکیلی ہے۔

آج دوپہر کو اچانک کچھ جاپانی عورتیں آ گئیں۔ دیکھنے کے لئے پورے پانچ سو کی چیزیں خرید کر لے گئی ہیں۔ اس وقت میرا بٹوہ بھرا ہوا ہے۔ یوں تو دل بھی بھرا ہوا ہے ......

لیکن تمہاری زورئی ہوں، تمہاری تخلیق کی قسم، اداس نہ ہوں گی۔

۱۷-۹-۱۹۶۸ء تمہاری —— زوربی

جیتی!

تم جتنی سبزیاں لے کر دے گئے تھے، سب ختم ہو گئی ہیں۔ جتنے پھل دے گئے تھے۔ وہ بھی ختم ہو گئے ہیں۔ فرج خالی پڑا ہے۔ لگتا ہے، میری زندگی بھی خالی ہوئی جا رہی ہے

---

[1] کندلا اُن دنوں پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ کے ہوسٹل میں تھی۔

جسم پہ ایک پسینہ دھوپ کا ہے اور ایک تمہاری عدم موجودگی کا —— اور میں دو قسم کے پسینوں سے بھیگی ہوئی ہوں۔

تمہاری زوربی، تمہاری امی، تمہاری ماجا

تمہاری —— بنّا

کتنا عجیب لگ رہا ہے! اسیّلی کی پہلی کمائی پہلی بار ہاتھ میں لی ہے۔ اُسے چھٹیوں میں کسی کا ایک پرس پیک ٹو بنانے کے اسی روپے ملے ہیں۔ چار روپے بورڈ کے کاٹ کر چھہتر روپے دیئے گئے ہیں۔ آتے وقت وہ تین روپیہ کا ترجنٹ سگریٹ میرے لئے خرید لایا اور تہتر روپے نقد دے دیئے۔ دوپہر کو یہ کمائی ہتھیلی پہ رکھی۔ شام کو تمہارا خط۔ میری دونوں ہتھیلیاں اس وقت امیر ہیں۔

۲۸ - ۱۲ - ۱۹۶۸ء   تمہاری —— زوربی

یہاں میں اس طرح تن تنہا پڑی ہوں، جیسے اندھے کی ماں اُسے مسجد میں چھوڑ کر گھر لوٹ آتی ہے۔

ٹوٹ جائیں وہ ریل گاڑیاں جو تمہیں لوٹا کر نہیں لے آئیں۔

غصہ سے بھری بیٹھی —— زوربی

کل گلزار آیا تھا۔ "سنا ہے، آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ مزاج پرسی کے لئے چلا آیا۔ کیا بات ہے؟" جواب دیا "یوں تو ٹھیک ہوں، لیکن شام کو درد ہونے لگتا ہے، جونہی سورج ڈوبتا ہے" گلزار ہنسنے لگا "پرانے زمانہ میں کسی نے دکال، کو پاوے سے باندھا تھا۔ آپ سورج کو پاوے سے باندھ لیجئے۔ اسے ڈوبنے مت دیا کیجئے"

یں نے اُسے بتایا ”وہ تو میں نے باندھ رکھا ہے۔ شام کو جب جیتی کا خط آتا ہے، وہ سورج ہی تو ہوتا ہے۔“

سچ، جیتی! تمہارا ہر خط شام کا سورج ہوتا ہے۔ کیا مجھ میں کوئی کم کرامات ہے؟ سورج کو پاوے سے باندھ سکتی ہوں!

۳—۱—۱۹۶۹ء　　　ہر سانس میں تمہاری منتظر — زوربی

تمہارے ساتھ جینا لے تو ایک زندگی بہت کم ہے۔ ایک تو آج اتوار ہے، دوسرے بے حد سردی۔ پھر ایک کندھے میں درد بھی ہو رہا ہے۔ شام کا اندھیرا میری ہڈیوں میں دھنستا جا رہا تھا کہ تمہارا خط ملاؔ۔ اور اب سوچتی ہوں، باقی زندگی تھوڑی کیوں رہ گئی ہے۔ شیؔ تو اپنے محبوب سے ملنے کے لئے ہزاروں سال زندہ رہی۔ لیکن میں وہ شیؔ ہوں جو تم سے ملنے کے بعد ہزاروں سال زندہ رہنا چاہتی ہوں۔

میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ لیکن کل جشنِ کرشن چندر تھا۔ گلزار گاڑی میں لے گیا تھا۔ چھوڑ بھی گیا تھا۔ وہاں دو منٹ کرشن کو سٹیج پہ گریٹ کرنا تھا (یہ تو تی کا تقاضا تھا) اس لئے ایک دو منٹ بولی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے پرے ی ذائنڈ کیا تھا۔ جانتے ہو، میں نے کیا کہا۔ اُردو میں کہا، ”تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی؟ وہ رخسار، وہ ہونٹ؟ زندگی جن کے تصور میں لٹا دی میں نے۔ فیض کا یہ شعر اپنے رقیب کے لئے تھا۔ میں سوچتی ہوں۔ ہم لوگ جو ایک قلم سے محبت کرتے ہیں، ہم بھی رقیب ہیں ایک دوسرے کے۔ ہم جانتے ہیں، وہ درد کیا ہے۔ ہم ہی جانتے ہیں، ہم اپنی زندگی کیوں لٹاتے ہیں۔

لہ میں جب امرتا سے دور ہوتا ہوں۔ ہر روز ایک خط لکھتا ہوں۔ اتوار کو ڈاک نہیں ملتی۔ اس لئے ایکسپریس لکھ دیتا ہوں، تاکہ اتوار کو بھی مل جائے۔

نظموں کا مجموعہ بھی شائع کیا جائے۔ اگلے سال سوچوں گی۔ اس سال تو ان پچیس کہانیوں کے ترجمے کرتی تھک گئی ہوں۔

ساؤتھ افریقہ والوں کا دلی کا دفتر مل گیا ہے۔ رچرڈ رائل کی تصویر کے لئے انہوں نے اپنے لنڈن آفس کو لکھا تھا۔ کسی دن گھر آ کر مجھے ملنا چاہتے ہیں۔

۱۸ — ۱۱ — ۱۹۶۸ء تمہاری — زوربی

میرے ایموا!

تمہارا پرمانٹ پتہ میں ہوں، میرا پرمانٹ پتہ تم۔ ابھی موصول ہوئے تمہارے خط سے لگتا ہے کہ میرے خطوط تم تک نہیں پہنچ رہے۔ میرے خطوں کے ساتھ ابھی یہ ظلم ہونا باقی تھا!

آج صبح تمہاری بیٹی کو رخصت کیا ہے۔ تمہارا کمرہ اس وقت اُس آنگن سا لگتا ہے۔ جہاں سے ڈولی روانہ کی جا چکی ہو — سُرخرو بھی اور خالی بھی۔

سیلو کا فون آیا تھا کل رات۔ وہ ۲۵ تاریخ کو آئے گا۔ فون پہ جن گن من گا رہا تھا..... اُس کی آواز سے مجھے ایک خیال سوجھا۔ گورو نانک پر طویل نظم لکھنے کے لئے نویگ والے کہہ رہے ہیں۔ وہ تو میں نہ لکھوں گی۔ لیکن خیال آتا ہے، ترپتا جب حاملہ تھی۔ نانک کی ماں — اُسے حمل کے ایّام میں کیسے خواب آتے ہوں گے، وہ لکھوں۔ نظم کا عنوان ہو۔ حاملہ۔ نانک جیسا بیٹا پیٹ میں ڈال کر اُسے ضرور بڑے حسین خواب آتے ہوں گے۔

۲۱ — ۱۱ — ۱۹۶۸ء تمہاری — زوربی

سیلی بہت اچھی کتابیں لایا ہے۔ اس وقت جو پڑھ رہی ہوں، وہ ہے

ا؎ رناگ منی، کو امرتا کئی بار پیار سے میری بیٹی کہا کرتی ہے۔

The true believer by eric hoffer تمہیں بھی بہت اچھی لگے گی۔
کیا کلیریٹی ہے فکر کی!

بیتلی کے ساتھ شام بھری بھری ہوتی ہے، وہ صرف کتابوں کی باتیں کرتا ہے —
اور کتابوں کی باتیں تو کوئی میرے ساتھ چاہے حشر تک کرتا رہے!

اس وقت دوپہر ہے۔ بیتلی اپنے کمرہ میں ریکارڈ بجا رہا ہے اور اُس کے پاس مس ٹالن
بیٹھی ہے۔ میرے پاس ہمیشہ تم.....

۲۹ — ۱۱ — ۱۹۶۸ء   تمہاری — نوری

ابھی تمہارا بنایا ایک فن پارہ دیکھا۔ لگا، تم سے ملاقات ہو گئی۔ اس وقت میرے سامنے
"ماضی کی پرچھائیاں" ہے۔ ڈاکیہ ابھی یہ کتاب دے گیا ہے۔ سرورق سے نگاہیں ہٹ
نہیں رہی ہیں۔ ٹائٹل پر اتنا اپنا چہرہ نظر نہیں آتا، جتنا تمہارا..... تمہاری کلا کو سو سو پرنام!

اور سنو! میری آج کی نظم میں ترپتا اپنی کوکھ کے آگے سیس جھکاتی ہے۔ کوکھ اُن
ہاتھوں کا سمبل ہے، جنھوں نے نانک جیسی مخلوق کی تخلیق کی ہے۔ میں تمہارے ہاتھوں
کے آگے سیس جھکاتی ہوں، تمہارے خلّاق ہاتھوں کے آگے۔ کسی بھی فنکار کی کوکھ اُس کے
ہاتھ ہوتے ہیں۔

۲۱ تاریخ کو ڈاک کی سٹرائیک کھل گئی تھی، اس لئے 'ناگ منی'، لے کر پوسٹ آفس گئی۔
انھوں نے کہا، ہم لینے سے انکاری نہیں ہیں، لیکن آپ کو صلاح دیتے ہیں کہ آج پوسٹ نہ
کریں۔ پچھلے بیگ کئی دنوں سے بھرے پڑے ہیں اور ملازمین ایک ساتھ اتنا کام نکال نہیں
سکتے۔ اس لئے رسالے، اخبار، پھاڑ پھاڑ کر پھینک رہے ہیں سوم دار کو فون کر لیں۔ اگر
حالات درست ہوں تو 'ناگ منی'، پوسٹ کر دیجئے گا۔

اس لئے آج ابھی ۲۳ تاریخ کو 'ناگ منی'، پوسٹ کر کے آئی ہوں۔ اس وقت میرے

تم جلتی سانس چھوڑ گئے تھے، ختم ہوئی جارہی ہے.....

جیتی! اوپر لکھے خط کو پڑھ کر دکھی نہ ہونا۔ رات کے گہرے اندھیرے میں لکھا تھا۔ میں اُداس ہوں، لیکن زویہ بی ہوں۔ تمہارے کام کا خیال آتا ہے تو اپنی تنہائی کو بہلا لیتی ہوں۔ نہ جانے، شاید یہ عمر کا تقاضہ ہے، زندگی کے باقی ماندہ دنوں کا احساس ہے.....

جیتی! اگر وہاں کام کا کوئی مستقبل دکھائی دیتا ہو تو ضرور سٹرگل کرو۔ لیکن ناحق نہ بھٹکنا۔ یہاں گھر بیٹھ کر یہیں سوکھی دال روٹی بھی بہت ہے (آج میں اسی برس کی یا پچھلے کسی زمانہ کی عورت کی طرح باتیں کر رہی ہوں —— شاید غیر فانی عورت ایسی ہی ہوتی ہے)

۶۶ — ۹ — ۱۹۶۸ء وہی غیر فانی —— ماجا

میرے مذہب، میرے ایمان!

تمہارے چہرہ کا تصور کر کے مذہب جیسی صدیوں پرانی چیز بھی تر و تازہ لگتی ہے۔ اور تمہارے خطوط؟ لگتا ہے، جہاں گیتا، قرآن، گرنتھ، بائبل آکر رک جاتے ہیں۔ اُس سے آگے تمہارے خطوط شروع ہوتے ہیں.......

اوتار دو تین دن میرے پاس رہ کر چلی گئی ہے۔ میری میز پر خلیل جبران کا اسکیچ دیکھ کر پوچھنے لگی "یہ اندرجیت کا اسکیچ ہے؟" مجھے اچھا لگا۔ اُسے تمہارا دھوکا بھی ہوا تو خلیل جبران کے چہرہ سے خد و خال میں فرق ہو سکتا ہے، مگر اصل چیز تو خیالات ہیں۔ سچ تو یوں ہے کہ تمہارے اس خط کو پڑھ کر تمہارے اور خلیل جبران کے چہرے میرے تصور میں ایک ہو گئے لگتے ہیں۔

ایک پاکیزگی جو تم میں دیکھی ہے، وہ کتابوں میں پڑھی ضرور ہے، مگر تمہارے سوا کسی اور شناسا چہرہ میں نہیں دیکھی۔

تمہارے جانے کے بعد ایک نظم لکھی تھی، تخلیق عمل اور ایک آرٹیکل — ایک کہانی بھی۔

لیکن یہ سب کچھ میری چھوٹی کمائی ہے۔ میری زندگی کی اصل کمائی میرا امروز ہے۔

گھر کب آؤ گے؟ تاریخ لکھو تاکہ انگلیوں پر دن گنوں اور انگلیاں اچھی لگنے لگیں۔

۶-۱۰-۱۹۶۸ء تمہاری — زوری

ایمو!

جو شہر تمہارے ہاتھوں کو کام سے بھر دے، وہ شہر مبارک!

کل شام "ناگ منی"، بتی، ناریل پھوڑا، گُڑ توڑا اور سب سے پہلے ایک ٹکڑا تمہاری یاد کے منہ سے لگا دیا۔

میلو[1] ابھی نہیں آیا۔ ۱۵ تاریخ سے ہر دستک پر چونک پڑتی ہوں۔ اُٹھ اُٹھ کر دیکھتی ہوں۔ کل دوپہر کو گھبرا کر تار دے دیا۔ ابھی تک جواب نہیں ملا۔ اُس کی مس شالن[2] بھی فون پر پوچھ لیتی ہے۔ پوچھتی ہے: "خط بھی نہیں آیا؟" میں اُس سے استفسار کرتی ہوں "تمہارے پاس بھی خط نہیں آیا؟" بیچ میں ایک جینریشن کا فرق ہے —— لیکن عورت آخر عورت ہے، چاہے ماں ہو یا محبوبہ۔

نہرو پرائز کے لئے جو روسی آئے تھے، مجھے ملنے کیلے بھی آئے۔ مریم تین چار بار گھر آئی۔ دو پیاری روسی نظمیں دے گئی ہے "ناگ منی" کے لئے۔ ایک کا ترجمہ کر لیا ہے۔ اب وہ شاعر کی تصویر بھی دے گئی ہے۔

کل صبح جرمن نمائندہ سے مل کر جرمن الفاظ کے تلفظ درست کروں گی، پریس میں دینے سے پہلے جرمنی سے خط آیا ہے کہ کہانیوں کے مجموعہ "جنگ کے بعد" کی طرح جرمن

---

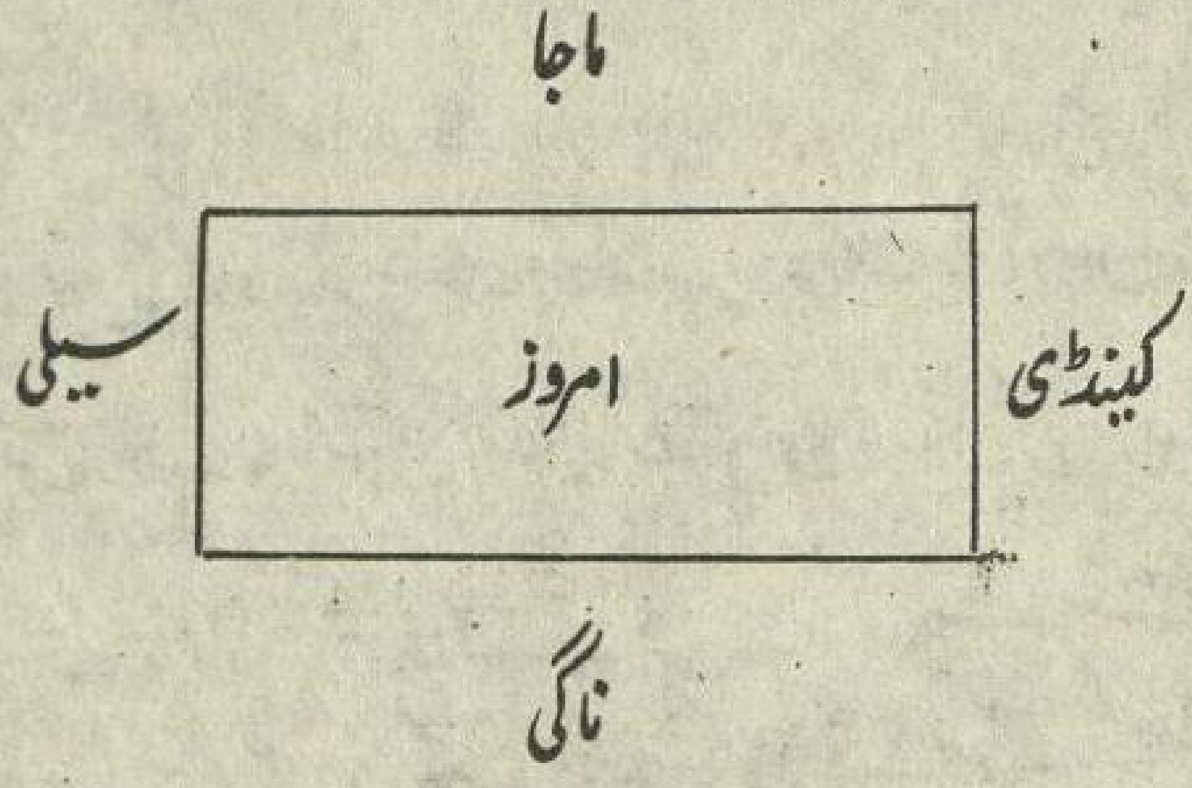
[1] امرتا کا بیٹا نوراج، جسے پیار سے بیل، میلو، چھمی۔ کئی ناموں سے پکارتے ہیں وہ اُن دنوں بڑودہ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔

[2] نوراج کی ایک دوست۔

کرشن ہمارا پیارا دوست ہے، ہمارا رقیب۔ آج اُسے سب سے بڑا کمپلی منٹ دیتی ہوں کہ ہم اُس کے رقیب، اُسے سلام کرتے ہیں اور نہ دل سے اُس کی صحت کے لئے دُعا مانگتے ہیں۔"

اس وقت میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ بستر میں بیٹھ کر تمہیں خط لکھ رہی ہوں یہ خط میرا نو سو میل لمبا بازو ہے۔

۱۲-۱-۱۹۶۹ء تمہاری ــــ زوری



یہ پورٹریٹ دنیا کی کس دیوار پر بناؤں، ایسا کوئی دیوار بھی تو ثابت نہیں ہے۔ کوئی دیوار دراڑوں سے بھری پڑی ہے اور کوئی سیلن سے۔ ایشور، نہ جانے، کیا آرکی ٹیکٹ ہے۔

میں تو جب بھی کسی سے ملتی ہوں، تنہا ہو جاتی ہوں۔ ہر ملاقات، ہر تعارف گویا تنہائی کا موجب ہوتا ہے پہلے سب لوگ مجھ سے اور تم سے دکھی تھے۔ اب سیلی اور ناگی، بھی اس قطار میں آ کھڑے ہوئے ہیں۔ مس سٹالن کی ماں سیلی سے دکھی ہے اور پنجابی کی ادبی دنیا ناگی، ہے۔

نئے شمارہ کی طباعت کے لئے پریس کو جتنی بار فون کیا، تیکھا سا جواب ہی کانوں میں پڑا۔ چاہتی تھی کہ ۱۹ تاریخ تک "ناگ منی"، تیار ہو جائے۔ لیکن جواب ملا "ناگ منی"، شام تک

نہ چھپا تو کیا قیامت ہو جائے گی؟"

میٹر کچھ زیادہ لگتا تھا۔ آج فون پہ کہا "آخری آرٹیکل ضرور جائے گا۔ اگر کہانی کا ایک صفحہ زیادہ ہے تو اُسے پورا کر لیں۔ نظموں میں صفحے کم کر دیں۔" تو جواب ملا "آخری آرٹیکل نہیں چھپے گا تو کونسا انقلاب رک جائے گا؟" بہت روکھی، جھلاہٹ بھری آواز تھی۔ جی چاہتا ہے۔ اپنے خواب گاہ میں ایک مشین لگوا لوں۔ خود کمپوز کروں، خود پرنٹ کر لوں۔

کاغذ والے جین کو بھی قریباً پندرہ بار فون کیا۔ وہ خود صرف ایک بار ملا۔ پھر ہر بار پیغام چھوڑتا گیا۔ لیکن واپسی فون کبھی نہ کیا۔ ابھی تک لفافے نہیں ملے۔

بالزاک یاد آ رہا ہے۔ اُس نے مجھ جیسی حالت جھیلی تھی —— پہلے پبلشروں سے دکھی ہو کر خود پبلشر بنا۔ پھر کاغذ والوں سے تنگ آ کر کاغذ کا کارخانہ کھول لیا۔۔

اب تو ایمایا! خود ہی خدا بننے کا وقت آ گیا ہے۔ یہ ساری دنیا مسمار کر کے نئی دنیا تعمیر کرنے کا وقت......

۱۵-۱-۱۹۶۹ء —— زوربی

ایک پوسٹ کارڈ:

تمہاری عدم موجودگی سے اپنا آپ بھی زندگی سے غیر حاضر سا لگتا ہے۔

آج کسی ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے کہا ہے، وہ تمہیں ایسی پڑیا دے، جس سے آدمی جھٹ سٹیشن پر چلا جاتا ہے، ٹکٹ بک کراتا ہے اور گھر لوٹ آنے کی بات کرتا ہے۔

ہائے او ربّا!

تمہاری —— ریشماں

ذیل کا پنجابی خط بجنسہٖ دیا جا رہا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ہے: "جینی! تم کب آؤ گے —— ماجا" الفاظ کے ہر حلقہ میں جینی کا لفظ بار بار لکھا ہے:

کی فائلوں کے لئے اور کمیٹیوں کے روشن دماغ ممبروں کے لئے میں کچھ نہیں لکھ سکتی۔ بہت الیف الیف سی کو بہت جھیل چکی۔

زندگی کے جو چار دن باقی ہیں، وہ اپنی ذات کے ساتھ، تمہارے ساتھ اور دنیا کی بڑھیا کتابوں کے ساتھ گزاروں گی۔

۵-۱۲-۱۹۷۵ء تمہاری ــــ ماجا

امیا!

کل رات ایک عجیب بات ہوئی۔ بہت رات گئے تک سولجے نتسن کی گلاک، پڑھتی رہی۔ اُس کا پہلا چیپٹر کسی آرٹسٹ کے بارے میں ہے کہ کس طرح آدھی رات کو اچانک دروازہ پر دستک ہوتی ہے اور وہ لوگ ایک معصوم آدمی کو پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ وہ پوچھتا رہ جاتا ہے "میں؟ لیکن کیوں؟" اور اس کیوں کا جواب آج تک کسی کو نہیں ملا۔ اور وہ آدمی یا تو بیس برس کے لئے جیل میں ڈال دیا جاتا ہے یا کہیں باہر گولی سے اُڑا دیا جاتا ہے۔۔۔۔۔

اور رات کو میں نے خواب دیکھا ــــ ہمارے دروازہ پہ دستک ہوئی۔ وہ لوگ میرے دار جی کو پکڑ کر لے گئے (خوابوں میں دار جی ابھی بقیدِ حیات ہیں) اور پھر صبح معلوم ہوا کہ اُنہوں نے دار جی کو بندوق کی گولی سے مار ڈالا۔۔۔۔

بھلا میں نے یہ خواب کیوں دیکھا؟ کیا لاکھوں لوگوں کی موت نے مجھے اس قدر متاثر کیا۔ کہ اُن کی موت مجھے اپنے پتا کی موت کے برابر محسوس ہوئی؟ یا یہ کہ دار جی کی موت دراصل قدرتی نہیں تھی؟ میری آنکھوں سے دور ہوئی تھی، پتا میں نہیں جانتی، کیسے ہوئی تھی۔ پہلی بار آیا ہے۔ تم جانتی ہو، دار جی کی موت کے بعد اس لڑکے گیان سنگھ نے اُن کی زمین جعلی دستخط کر کے فروخت کر دی تھی۔ کون جانتا ہے۔ اُن کی موت ایک راز ہو، جو مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا۔ عجیب خواب ہے۔۔۔۔۔

ــــ ماجا

۲۸-۱۲-۱۹۷۵ء

امرتا کے خطوط مرتب کر چکا تو اب وہ کہہ رہی ہے "دیکھو، امروز! یہ واقفیت نامکمل ہے۔ کافکا کی محبوبہ پر لکھی ایک کتاب کے دیباچہ میں آر تھر کوسلر کہتا ہے : کافکا کے خطوط تو مل گئے، لیکن ملینا کے خطوط کے بغیر اُس کی پورٹریٹ نامکمل ہے۔ وہ ملینا کے خطوط کو' میرے جلتے سر پر بارش کی بوندیں' کہا کرتا تھا اور وہی بارش کی بوندیں نہیں مل رہیں ...... لیکن غنیمت ہے کہ میرے نام لکھے تمہارے خطوط ضائع نہیں ہوتے۔ وہ خطوط بھی اس مجموعہ کا ایک حصّہ ہیں۔ تمہاری اس تالیف کے لئے وہ خطوط نہیں عاریتاً دے سکتی ہوں۔ لہٰذا امرتا سے عاریتاً لے کر میں اپنے خطوط بھی اس مجموعہ میں شامل کر رہا ہوں:

اتنی پختہ زبان لکھنے والی! اتنا انوکھا سوچنے والی! تمہارے ساتھ وابستہ خوف وہراس بھلے نہیں لگتے ہیں، دیکھے نہیں جاتے اور پھر میرے ہوتے؟ میری مانو، اتوار کو ذرا اور بڑا کر لو۔ اور دیکھو، جوں جوں اتوار کو بڑا کرتی جاؤ گی، خوف اُسی تناسب سے سکڑتے جائیں گے۔ عمر کو سالوں کے حساب سے کیوں گنتی ہو؟ میرے انہماک کے اعتبار سے کیوں نہیں شمار کرتیں۔ تم میری ساری ان ٹن سٹی، میری ساری دھڑکنیں اپنا لو۔ میرا انہماک ہی تمہاری عمر ہے، میرا انہماک ہی تمہاری صحت ہے۔

اب تم اپنے ماضی کو، ماضی کی تلخیوں کو ترک کر دینے کی تکلیف سہہ رہی ہو۔ لیکن ترک کی یہ تکلیف عارضی ہے۔ آؤ! مستقبل میں آ جاؤ۔ مستقبل اپنی مسکراہٹوں کے ساتھ اپنا دل، اپنا دروازہ کھولے تمہارا منتظر ہے......

بمبئی۔

۲ - ۱۰ - ۱۹۶۹ء

قسمت کا منتظر مستقبل ــــ جلتی

او میرے ایما!

آج سیتی دو تین دن کے لئے پٹیالہ گیا ہے۔ تنہائی اور گہری ہو گئی ہے "ا رومن ایمپائر کی طرح بے سروپا۔ ایچ جی ویلیز لکھتا ہے "رومن ایمپائر بڑھتی گئی۔ ان پلینڈ ناول کی طرح، اور پھر یک بارگی کولیپس ہو گئی۔" یہ تنہائی بھی یکبارگی کولیپس ہو جائے گی۔ جب تم آؤ گے......

۲۷-۷-۱۹۷۲ء تمہاری ــــ ایمی

ایموا!

کل تمہارا کمرہ بند رکھا تھا۔ آج دل بہت اُوب گیا تو کمرہ کھول دیا۔ لیکن سارے فرش پر پھیلی اور چھت تک چھائی خاموشی کا طلسم نہیں ٹوٹ رہا۔

۱۵-۵-۱۹۷۴ء تمہاری ــــ ایما

ایموا!

آج تمہیں ایک دلچسپ بات بتاؤں۔ کل دیویندر آیا تھا۔ کہنے لگا۔ اردو کا کوئی شاعر ہے۔ وہاں ریڈیو سٹیشن میں۔ دیویندر سے کہوں گا، مجھے امرتا پریتم سے تین ہزار روپے لے دو۔ بڑی ضرورت ہے۔ سنا ہے، وہ لوگوں کی بڑی مدد کرتی ہے،، نوراج پاس ہی بیٹھا تھا۔ کہنے لگا "دیویندر انکل! اس سے کہیے کہ دھیرے بولے۔ کہیں اندرا گاندھی نے سن لیا تو امرتا پریتم کو نیشنلائز کر دے گی۔،،

آج سوموار ہے۔ ابھی ابھی سورج نکلا ہے۔ ذرا اور اونچا ہوگا تو تمہارا خط آئے گا۔ تمہاری آواز نہ جانے کب آئے گی، پاؤں کی آواز سیڑھیاں چڑھتے ہوتے۔

۲۷-۵-۱۹۷۴ء تمہاری ــــ ماجا

امیوا

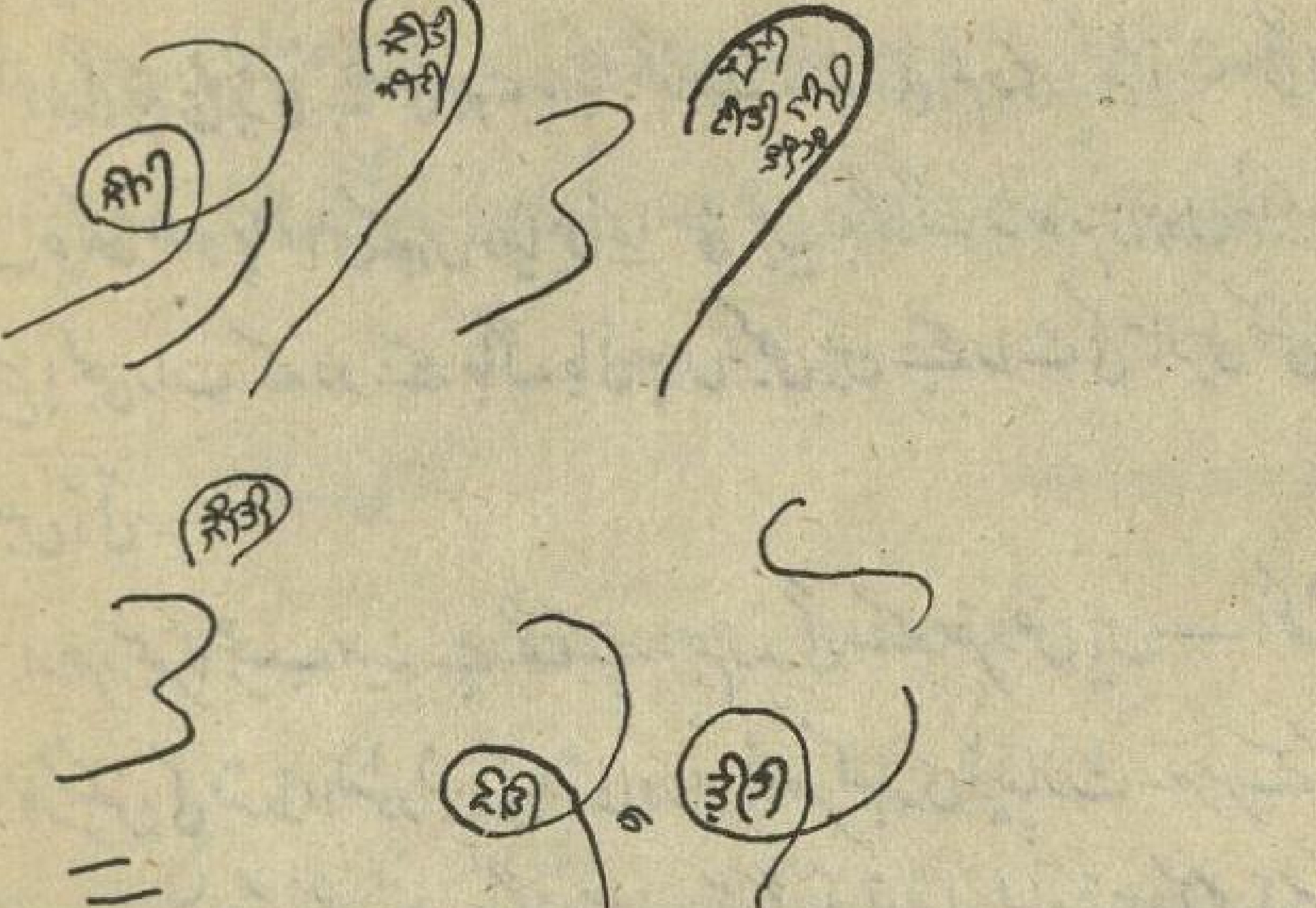
زندگی سچ مچ بڑی بے معنی ہے۔ مجھے لگتا ہے — آئی ایم دی وکٹم آف مائی اون ایڈیلزم آج تک جو لکھا، سوچا، اس کے اس دنیا میں کیا معنی ہیں؟ گلاگ پڑھ رہی ہوں۔ ایک بھیانک ٹوار سچ! کبھی رات کے دو بجے جاگ جاتی ہوں۔ کبھی تین بجے رات کی تاریکی کسی طور ختم ہونے میں نہیں آتی۔

ادھر دسمبر کا عجیب مہینہ ہے۔ لگتا ہے۔ ہم زندگی کے مقروض ہیں — انکم ٹیکس کی قسط، کار ٹیکس کی قسط، انشورنس کی قسط اور پھر ادھر کمپلیری ڈیپازٹ۔ مر مر کے کماؤ، ایمانداری سے ٹیکس ادا کرو، پھر کھائیں پیر سے گنواؤ اور پھر آگے آنے والے وقت کی کوئی سیکیوٹی نہیں۔ اب تو کچھ لکھنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ انسان کے اندر کی حقیقت کی جھوٹی امیدوں کو زندگی بھر خود بھی جھیلا ہے، اوروں کو بھی جھوٹے خواب دیکھنے کے لئے کہا ہے یہ ساری تحریریں کس کے کام آئیں؟ کیا ان سے دنیا میں کچھ بہتری ہوئی؟ بالکل نہیں۔ کبھی کچھ نہیں ہوگا... رہی بات فلم کی۔ اگر باسو کو وہ بات نہیں رہی تو میں یاد دلانے کے لئے بمبئی نہ آؤں گی۔ بہت تھک گئی ہوں۔ جہاں اور بہت کچھ بے معنی لکھا پڑا ہوا وہاں یہ بھی سہی۔ مجھے کوئی گلہ نہیں اور نہ کوئی امید ہے۔

۱۴-۶-۱۹۷۵ء — ماجا

میرے امیوا!

چنڈی گڑھ سے فون آیا ہے کہ پنجاب سرکار "عورتوں کا پنجاب کو عطیہ" کے عنوان سے ایک فلم بنانا چاہتی ہے (وہی پوجا کپور اور ہدایت کار بھارتی کا فون تھا) اور کہ میں سرکار کو اس فلم کے سناپسس لکھ کر بھیج دوں۔ سناپسس اپروو ہو گئے تو پوجا فلم بنائے گی۔ میں نے اس طرح اپروو ہونے کی شرط کے باعث سکرپٹ لکھنے سے انکار کر دیا ہے۔ گورنمنٹ



ایما!

جوہُو کے کنارے پتوں سے ڈھکی کاٹیج میرے خیالوں میں بس گئی ہے۔ . . . .
جی چاہتا ہے، سارے بکھراؤ سمٹ جائیں۔ بل اور ٹیکس کانٹوں کی طرح چبھ رہے ہیں۔ (ابھی پانی کا بل آیا ہے۔ کار کی انشورنس کا بل بھی آنے والا ہے اور ہاؤس ٹیکس بھی) ، ناگ منی، بھی محتاج ہے۔ پریس والوں کے موڈ کا۔ سب سمیٹ لوں اور کاٹیج میں پھول پتے اُگایا کروں۔ پودوں کو پانی دیتی رہوں اور بس دو وقت کچھ پکا کر کھالوں۔ نہ شہرت چاہیئے نہ پیسہ۔ پھولوں کے ساتھ مل کر پھولوں کی طرح کھلوں اور پھر چپ چاپ

مرجھا جاؤں۔ تم جو کچھ بھی کہہ کر لاؤ، آٹا دال پکالوں دو جنم کا۔ او میرے ایمو!

۲۳-۷-۱۹۷۱ء ——— ماجا

ایموا!

شکر ہے، سورج ہر روز تمہارا خط لے کر آتا ہے اور کرنوں جیسے تمہارے خیالات ——— ورنہ یہ دنیا رہنے کے قابل نہ تھی۔ آج ٹی وی کی ریکارڈنگ تھی۔ وہاں جا کر معلوم ہوا۔ ہری بھجن اپنی ڈوبیاں، چمچے لے کر بیٹھا ہے۔ گھر میں کازن تنزاکس پڑھنی گئی تھی، گر یک پیشن ——— وہاں جا کر کنٹراسٹ دیکھا۔ لیکن شکر ہے، آتے ہی تمہارا خط ملا، پاک، کازن تنزاکس کے دل کی طرح خوب صورت۔ راستہ کی گرد پوچھ کر میں نے خط لکھا اور اپنی رو میں آگئی۔ اس بار تمہیں جلدی جانا پڑے گا، تمہیں بھی یورپ جانے کی تیاری کرنا چاہیئے۔ پھر واپس آ کر بمبئی رہ لیں گے۔

۱۱-۷-۱۹۷۲ء تمہاری ——— ایمی

او میرے ایما!

اگر کسی دن مجھے تمہارے بغیر جینا پڑا تو ایشور سے بھی کہہ دوں گی: "نہیں، تمہارے بغیر لاچار ہو کر جینے سے بالکل انکاری ہوں۔ اگر زندگی سے زندگی کو نکال دیں، تو باقی جو کچھ بچتا ہے، وہ مجھے نہیں چاہیئے۔"

کل رات کا تمہارا فون میری سانسوں میں جان ڈال گیا۔ یورپ کی کوئی بات نہیں۔ اگر بمبئی ہمیں کوئی مستقبل دے سکتے، تو وہی ٹھیک ہے۔

۱۹-۷-۱۹۷۲ء ——— ماجا

میری کائنات، میرے انہماک!

سجدہ۔

اس سجدہ کے بعد ہمارے درمیان کا نوسومیل کا یہ ریگستان خود بخود ہٹ جاتا ہے۔ تم میری تقدیر بنی رہو۔ پھر مجھے کسی بدقسمتی کی پروا نہیں۔

بمبئی

۲۴-۱۰-۱۹۵۹ء تمہارا ــــ جیتی

تقدیر کو اپنی پہلی دیوالی مبارک! اور اپنی سبھی عزیزوں کو بھی۔ اپنا سب کچھ سنبھال کر رکھنا۔ یہ میری امانت ہے۔ میری اس امانت کے ساتھ اداسی کی زیادتی نہ کرنا۔

دیکھو، میں کتنا قوی ہوں! روٹھی روزی کے ساتھ پردیس میں کس طرح برسرِ پیکار رہوں۔ میں نے کبھی نیگیٹو نہیں سوچا۔ نہ یہ میری فطرت ہے نہ میں کسی مشکل کے آگے جھکنا چاہتا ہوں۔ میرے سارے راستے کٹھن ہیں۔ تمہیں بھی جس راستہ پہ ملا، سارا کٹھن ہے۔ لیکن یہی تو میرا راستہ ہے، یہی تمہارا راستہ بھی ہے۔ مشکلیں بھلا کب تک ہمارے ساتھ چلیں گی؟ ہمارے قدم اتنے مضبوط، دلیر اور تیز ہیں۔ ہم تقدیر کے بچے ہیں۔ تمہارا جیتی کبھی ہارنا نہیں چاہتا؟......

بمبئی

۲۹-۱۰-۱۹۵۹ ......

ظالم!

ایک بار آواز دو کہ تم مجھے اپنے پاس لے جاؤ۔ میری تقدیر! میں صرف اِس آواز کا انتظار کر رہا ہوں۔ وقت انتظار کر رہا ہے، میرا حال انتظار کر رہا ہے، میرا مستقبل انتظار

کہہ رہا ہے۔ ایک آواز دے دو۔ میں سب کچھ تمہاری نذر کر دوں گا۔

شام ساڑھے سات بجے

۱-۱۱-۱۹۵۹ء — تمہارا سب کچھ —— جلتی

یہ خط شدنی کے ہاں سے لکھ رہا ہوں۔

تم بتی ہو، میں چراغ۔ اس طرح ہم سب کچھ ہیں، لیکن اجالا نہیں۔ آؤ، ایک دوسرے سے مل کر ذرا اٹھیں۔ اپنا سب کچھ روشن کر لیں۔ بتی اور چراغ کی منتیں بھی ایک نہ ایک دن قبول ہوں گی......

۱۲-۱۱-۱۹۵۹ء ....

اے حاضری لگانے والی!

آگر رجسٹر ہی کیوں نہیں سنبھال لیتی؟ ایک پرفضا مقام پر مکان لے لیا ہے۔ آگر اسے گھر بنا دو۔ اپنا اور اپنے خوابوں کا گھر۔ زندگی میں پہلی بار میں نے گھر کی خواہش کی ہے۔ جب میں تم سے ملا تھا، تم ناممکن جیسے مقام پر تھیں۔ مجھ پہ پورا بھروسہ کرو، میری یگانگت پہ اعتبار کرو۔ جینے کی حد تک تمہارا، تمہاری زندگی کا ضامن، تمہارا جینی!

میں اپنے ماضی، حال اور مستقبل کا پلّو تمہارے آگے پھیلاتا ہوں۔ اس میں اپنے ماضی حال اور مستقبل کو ڈال دو ؎

میرے جنوں، مری وحشت کا امتحان تو لو
اور اپنے حسن کی عظمت کا امتحان تو لو

ناامید مت ہو، آشی! میں آ رہا ہوں۔ امیدوں کی تصویر کو ماضی کے شکستہ آئینہ میں

زندگی سے فرصت ملے یا دل اُوب جائے تجھے بلا لینا جو کچھ میرے پاس ہوگا، تمہارے لیے، تمہاری زندگی کے لئے پیش کر دوں گا۔ شام[1] تک تو آ ہی جاؤ گی؟ شام تو جی کر دیکھ لو۔ اب میں ایک پاگل ہوں اور تم ایک شاعرہ۔ مزہ جب آئے گا، جب تم بھی اس پاگل کے لئے پاگل ہو جاؤ گی۔ تب تک کے لئے میری اور تمہاری شاعری کو سلام!

۲۱-۲-۱۹۶۰ء تمہارا پاگل ـــــ جیتی

میں اپنی زندگی کا نوٹ تمہارے آستانہ پر چڑھا چکا ہوں۔ اب یہ تم پہ ہے، بھنا لو، خرچ کر ڈالو، یا دہلیز پر ہی پڑا رہنے دو۔ تم خرچ بھی نہ کرو اور اُٹھا بھی دو ـــ کوئی تو ڈھب کی بات کیا کرو! میرا فن بھی تو تمہاری ہی دولت ہے، تمہارے خرچ کرنے کے لئے۔ میری عمر مجھ سے لے لو۔ مجھ سے اس کی تپش برداشت نہیں ہو رہی۔ اپنی یہ امانت مجھ سے لے لو، اے صبروں والی! کبھی میری بے صبری کے بھی تو دیکھو۔

۲۲-۲-۱۹۶۰ء

تمہارے انتظار میں شام اُتر آئی ہے، تمہارا خط نہیں آیا۔ خیریت تو ہے؟ اے میری امید کے رنگوں کی محافظ! خیال رکھنا، ان رنگوں پر کوئی پرچھائیں نہ پڑے اور نہ انہیں کوئی تپش لگے۔ انہی رنگوں کی تلاش میں، دیکھو، میں سب کچھ گنوا چکا ہوں اور اب وہ رنگ میرے ہیں۔ اس خوش نصیبی کی مسرت میں مجھے کچھ گنوا دینے کا غم نہیں۔ میری رحمت! میرے انتظار میں رہو۔ سارا حال، گھڑی گھڑی کا، پل پل کا رنگوں کی خبر دیتا ہے!

۲۶-۴-۱۹۶۰ء انہی سب رنگوں کا ـــ جیتی

---

[1] زندگی کی شام

کو ملکہ!

اپنے سارے سرمائے کا ایک نوٹ بنا کر تمہارے آنچل میں باندھ رہا ہوں ——— تمہارے عدم اعتماد کے پلو میں۔ اپنی آرزوئیں، تمنائیں ہمیشہ کے لئے اس شہر سے منقطع کر کے تمہارے شہر، تمہاری آرزوؤں، تمہاری مسرتوں کے ساتھ وابستہ کر رہا ہوں۔ اور اپنا اعتماد بھی تمہاری بے اعتمادی کے ساتھ۔ میں تو آ ہی رہا ہوں۔ اب دیکھئے، اتوار کب آتا ہے۔

۲۹-۴-۱۹۶۰ء

میری قسمت! میری ملکہ!

میں خود تمہارے پاس آرہا ہوں۔ اسی ویرِدار، ۵ رمئی کو صبح دس بجے تمہارے شہر میں پہنچ جاؤں گا۔ تم تیار رہنا۔ میری صاحبان! اپنی نیّا پہ بٹھا کر اب میں ہمیشہ کے لئے تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تمہیں سنبھال لوں گا۔ اپنی دوپہر کے سارے رنگ تمہاری شام میں ملا کر تمہیں اور حسین، اور رنگین بنا دوں گا۔ ایک دن اور انتظار، صرف ایک دن اور، جہاں پہلے تین سال کا طویل انتظار کیا تھا ——— زندگی جتنا طویل۔

۳-۵-۱۹۶۰ء بالکل تمہارا ——— جیتی

سنو! ٹو لوسم باڈی از ناٹ جسٹ اے سٹرونگ فیلنگ، اٹ از اے ڈیلیشن، اے ججمنٹ......

میں آج بھی صرف تمہیں بتا سکتا ہوں اور بتا رہا ہوں کہ میں کتنا بے چین ہوں۔ اور کسی کی سمجھ میں آ نہیں سکتا۔ چاہے اس وقت تمہیں میری کوئی بھی بات سنائی نہ دے۔ لیکن میں اور کسے بتاؤں؟ چاہے ہم کہیں دور جا بیٹھے ہیں، بے معنی ہو کر، شاید اس خط کی طرح بے جان ہو کر بھی۔

۳-۱۱-۱۹۶۰ء

رات کے دو بج چکے ہیں۔ تمہارے بغیر یوں لگتا ہے، جیسے زندگی کی سبھی نعمتوں سے محروم ہوں۔ کوئی کتنا غریب ہو چکا ہے، تم نہیں سمجھ سکیتں، اے میری دولت! آؤ جتنی خرچ ہو سکے، جینے کے لئے اُتنی خرچ کر ڈالیں۔ آؤ، ایک دوسرے کا نوٹ بھُنالیں۔

۱۳-۲-۱۹۶۰ء ......

اب اور اُدھار نہیں دیا جاتا۔ شُدنی بڑے دلفریب کھیل ہمارے ساتھ کھیل چکی ہے اب ہماری باری ہے۔ شُدنی سے ہم کھیلیں گے۔ میری حسین شام! آؤ، یہ شام جی لیں۔ سارے من سے، سارے تن اور سارے فن سے۔

۱۸-۲-۱۹۶۰ء ......

بدنصیب اتنی میری قسمت ہے، میری خوش قسمتی۔ اگر یہ شام حسین ہے تو میں اس شام کو دل کی ساری مجبوری اور مضبوطی کے ساتھ، مردانگی کے ساتھ اور اپنی دوپہر کے ساتھ گزاروں گا۔ جیوں گا۔ وقت چاہے دُور کھڑا دیکھتا رہے اور چاہے ہمارے ساتھ ہو کر رہے لیکن ہم جیئں گے اور وقت سے کہیں زیادہ خوبصورت جیئں گے، اسی وفا، اسی اعتماد کے ساتھ۔

۱۹-۲-۱۹۶۰ء تمہارا — جیتی

تمہارا خط نہیں آیا، نہ سہی مجھے خطوں کا انتظار نہیں، تمہارا انتظار ہے۔ تم نے کیا کہا تھا — "بدنصیبی!"، بدنصیبی تو بڑی آسانی سے آجاتی ہے۔ تم اتنی منتوں سے بھی نہیں آتیں۔ بدنصیبی تو اپنے آپ، بن بلائے آجاتی ہے۔ لیکن تم تو آتی ہی نہیں! لہذا تم بدنصیبی نہیں ہو، ضرور میری خوش قسمتی ہو۔

۲۰-۲-۱۹۶۰ء

تمہیں ٹرنک کال کیا تھا کہ تم سے باتیں کر کے دل کو کچھ سکون ملے گا۔ لیکن وہ اور بے چین ہوگیا۔ دل کسی بات میں نہیں لگتا۔ گھر خالی خالی لگتا ہے۔ باہر جاتا ہوں تو باہر بھی دل نہیں لگتا۔ گھر لوٹ آتا ہوں۔ اپنے آپ سے اُڑ کر تمہارے پاس جاتا ہوں اور جیب جایا نہیں جاتا، اپنے آپ سے لڑتا ہوں اور دل بے چین ہو جاتا ہے۔ کام بھی صرف کچھ کمانے کی خاطر ہی کر سکتا ہوں۔ پورے انہماک سے نہیں کر سکتا۔ سارا دل میرے پاس ہے ہی کہاں؟ کوئی دل کو ہتھیا کر کہیں دُور بیٹھا ہے، نہ جانے، اُسے اس طرح بیقرار کرنے اور تڑپانے سے کیا ملتا ہے؟ کیا تسکین حاصل ہوتی ہے؟ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم یہ سب کچھ کر رہی ہو۔ کوئی اتنا کیوں پاگل ہو جاتا ہے، کسی کے لئے؟ کیوں؟ لیکن تمہیں اس سے کیا؟ اے خط نہ لکھنے والی، اے خاموش رہ جانے والی! اے میری صبروں والی! تمہیں اس سے کیا؟ تمہاری خاطر کوئی حال سے بے حال ہو جائے۔

اچھا، تم ایک بار آؤ تو سہی۔ پھر میں اپنی بدنصیبی سے دو دو ہاتھ ہو لُوں گا۔ اگر تم میرے پاس آجاؤ تو میں کبھی قسمت کا، وقت کا شکوہ نہ کروں گا۔

ظالم!

جس سے تمہارے بغیر رہا نہ جائے، وہ کیا کرے؟ کیا تم مجھے پاگل بنا کے چھوڑو گی؟ اس دوپہر کو کیوں کھو رہی ہو انتظار میں؟ اسے جی کیوں نہیں لیتیں؟ کیا جدائی تمہیں بہت محبوب ہے؟ کیا اس کے بغیر تمہاری شاعری زندہ نہیں رہ سکتی؟ فرقت کی شاعری سے تمہیں شہرت ملتی ہے۔ اس نے تو تمہیں یہ اونچا مقام دیا ہے۔ تم زندگی کے بغیر زندہ رہ سکتی ہو، اس کے بغیر نہیں۔ ہمیں زندگی کی یہ بددعا کس نے دی ہے؟ اچھا، جیسے تمہیں

لہ زندگی کی دوپہر

مت دیکھو، مستقبل کے ثابت آئینہ میں دیکھو۔ ٹوٹے ہوئے اعتباروں کی کرچیں پھینک دو۔
ثابت دل میں مجھے دیکھو۔ میری ساری کائنات تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ صرف تمہارا۔

پردیس میں یہ میرا پہلا دن ہے۔ مشکل راہوں پہ پہلا قدم میں نے ثابت دل سے اٹھایا ہے۔ مجھے اپنی قسم کا آرٹسٹ بننا ہے۔ تم میرے ساتھ مل کر میری ہمت، میرا فن اور میرا اشتیاق بن جاؤ۔ اس نو سو میل کے فاصلہ پر میرے ایمان کا ہاتھ پکڑ کر ایک پل بنا دو۔ میں ہر سانس میں تمہارے پاس ہوں۔ یہ مختصر سی فرصت ہماری ملاقات کے رنگ کو اور گہرا اور پختہ بنا دے گی۔

۲۲-۱-۱۹۶۰ء اسی اعتماد کے ساتھ — تمہارا

میری حسین زندگی!

آج اس حسن کا ایک حسین خط ملا۔ ایک حسینہ کا ایک حسین، پیغام ملا ہے۔ یہ سالگرہ۔ یہ خط میرے لئے باعث فخر ہے۔ تم میری زندگی کا ایک حسین فریب ہو اور خوبصورت حقیقت بھی۔

۲۶-۱-۱۹۶۰ء ......

میں جتنا کل خوش تھا، اتنا ہی آج اداس ہوں۔ جی چاہتا ہے، سب کچھ ترک کر کے سارے فاصلے الانگھ کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں اور پھر تمہارے بغیر کبھی نہ رہوں۔ آشی! تمہارے بغیر زندگی زندگی نہیں لگتی، ایک سزا لگتی ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ زندہ رہتے سزا جھیلے؟ کام میں اگر جی لگتا ہے تو کام کے بعد سخت ڈپریشن آجاتی ہے کہ میں یہاں کیوں ہوں، تمہارے بغیر کیوں ہوں۔ اپنے آپ پر غصہ آتا ہے، سخت غصہ!

— صرف تمہارا

۲۷-۱-۱۹۶۰ء

جی کسی طرح بھی نہیں لگتا۔ سارا دن نہ کہیں جانے کو جی چاہتا ہے، نہ کسی سے ملنے کو، بس، بار بار دروازہ کی طرف جاتا ہوں، شاید تمہارا خط ملے۔ لیکن نہیں۔ شام کو آٹھ بجے تمہاری آواز سنی (ریڈیو پر) کچھ تسکین ہوئی کہ تم آگئی ہو۔ شاید نیپال کے پانی کا کچھ اثر ہو جو تم نے خط نہیں لکھا......

۲-۲-۱۹۶۰ء ....

مرے انتظار کی تصویر! بولتی کیوں نہیں؟ بولو تو سہی، چاہے غصہ میں ہی بولو، شکایت سے بولو، لیکن کچھ کہو تو سہی۔ کوئی حکم دو، ایک بار کچھ تو منہ سے کہو۔ تمہارے حکم کی تعمیل میں سب کچھ قربان کیا جاسکتا ہے۔ میری وحشت، میرے جنوں! میری حقیقت کا امتحان تو لو۔ میں دنیا کا سارا حسن، ساری مسکراہٹیں تمہارے لبوں پر دیکھنے کے لئے جی رہا ہوں......

۳-۲-۱۹۶۰ء ....

ابھی ابھی تمہارا خط ملا، اپنی ملکہ کا پیغام۔ میں اپنے سبھی خط پوسٹ کرنے چلا تھا۔ جو ہر روز تمہیں لکھا کرتا تھا، تمہارے ساتھ باتیں کیا کرتا تھا۔ اُداس نہ ہونا، ناراض نہ ہونا۔ ایک طویل خط میں نے تمہیں نیپال بھی لکھا تھا۔ شاید تم تک نہیں پہنچ پایا۔ ورنہ تم میرے بارے میں ایسا نہ سوچتیں۔ تم میری شام ہو، میری صبح ہو، یا پھر دوپہر ہو — میں نہیں جانتا — لیکن تم میری منزل ہو، میری تقدیر ہو۔ اب، اور کبھار پہلے بھی، مجھے لگتا ہے جیسے بمبئی آکر میں اپنی ملکہ سے گستاخی کر بیٹھا ہوں۔ یہ سوچ کر دل شئے — اپنے کام، اپنے فن، ہر چیز سے ہٹ سا گیا ہے۔ تم حسین شام ہی سہی، لیکن بھولو مت تم ہی میری صبح ہو، میری دوپہر ہو۔ جی کر دیکھو، پورے دل سے، اپنے جیتی کے ساتھ۔

۳-۲-۱۹۶۰ء ....

بڑے کالے ٹرنک میں تمہاری چیزیں سنبھال کر رکھ رہا تھا۔ پہلے تمہاری ساڑھیاں رکھیں، پھر تمہاری قمیصیں، شلوار، رومال اور چوڑیاں رکھیں۔ تمہاری فائلیں رکھیں، تمہاری کہانیوں اور نظموں کی کتابیں رکھیں اور آخر میں، سب کے اوپر سفید اُون کے تین گولے اور سلائیوں میں پڑی اپنی نامکمّل بنیان رکھی۔ اگر کبھی وہ مکمّل ہو جاتی...... ! میری ادھوری زندگی میں بھی تمہاری یاد کی سلائیاں اس ادھوری بنیان کی طرح ٹنگی ہوئی ہیں اور شاید ہمیشہ ٹنگی رہیں گی۔ ٹرنک میں ابھی اور بہت جگہ تھی۔ میں نہ جانے کتنا عرصہ اُس ادھوری بنیان میں اپنے دونوں ہاتھ ڈال کر، ٹرنک میں اپنا سر، اپنا دل رکھ کر پڑا رہا۔ اپنے ادھورے خواب اُس ادھوری بنیان میں سموتا رہا۔ کبھی یہ ٹرنک میرے پورے ہوتے خوابوں سے بھر کر بمبئی آیا تھا...... میری ادھوری تصویریں بھی ملیں، ضرور دیکھنا۔ تمہاری آنکھوں میں یہ تصویریں، ورنہ فقط لکیریں......

۴-۱۱-۱۹۶۰ء

وہ دن، وہ راتیں، وہ تم، وہ میں، وہ تمہاری باتیں، وہ میری امانتیں، وہ میرے لمحے...... کیا معلوم تھا، وہ میرا جیتی لے جائیں گے، میرا مرد لے جائیں گے۔ میرا اطمینان اشتیاق سب کچھ لے جائیں گے۔ لیکن میں تمہاری طرح خاموش نہ رہوں گا۔ میں اپنا سب کچھ لے جانے والے کو جرأت کی حد تک، ہمت کی حد تک، زندگی کی حد تک، نظر کی حد تک، تصور کی حد تک ڈھونڈوں گا۔ ڈھونڈ کر لے آؤں گا۔

"نصیب کے لئے بھٹکنے والا"

۱۲-۱۱-۱۹۶۰ء بدنصیب —— جیتی

سوڈ پوصاف کر رہا ہوں۔ چھوٹی میز پر دھری تمہاری پورٹریٹ کو پونچھتے ہوئے

ہاتھ رک گئے۔ آنکھیں ٹھہر گئیں تصویر کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ جس تصویر پر میں کتنا فخر محسوس کرتا تھا۔ اُس تصویر کا کریئیٹر، خود آرٹسٹ، اُس تصویر کے سامنے جھک گیا۔ میری آنکھوں میں نظریں جھک گئیں۔ اس میں میرا نام جھک گیا۔ اب میں اُس تصویر سے آنکھیں نہیں ملا پا رہا! لیکن میں، ہر روز اُس کی پوجا کرتا ہوں۔ کون جانے، میری پوجا کب قبول ہوگی۔۔۔۔

۱۴-۱۱-۱۹۶۰ء

رات کو خواب میں (دیکھا) تم کچن میں گوبھی کی گرم گرم روٹیاں بنا رہی تھیں میں اور سیلی تمہارے دائیں بائیں بیٹھے کھا رہے تھے۔ تم کھلا رہی تھیں، مسرور تھیں۔۔۔۔ آج صبح سے کمرہ میں لیٹے بیٹھے سوچ رہا ہوں۔۔۔۔۔ آج میں کچھ بھی نہ کھا سکا۔ رات کو تمہارے ہاتھوں سے بہت کھا لیا تھا نا۔۔۔۔۔

۱۸-۱۱-۱۹۶۰ء

میرے خط تمہیں نہ لا سکے، تمہیں نہ بلا سکے۔ تمہاری تکلیف، تمہاری حالت کو میں سمجھ سکتا ہوں۔ آشی! نہ جانے، میں تمہارے بغیر کیوں نہیں رہ سکتا، کیوں نہیں جی سکتا۔ میں نے دیکھ لیا ہے جس دن سے تمہارے پاس سے آیا ہوں، کچھ بھی کام نہیں کیا ہے، نہ ہوتا ہی ہے۔ تمہارے بغیر کچھ بھی سوچا نہیں جاتا۔۔۔۔ زندگی تو دور کی بات ہے۔۔۔۔ میں تڑپ رہا ہوں، اپنی آگ میں آپ ہی۔۔۔۔ اسی جرأت اور یقین کے ساتھ، جس سے تمہیں اپنایا تھا۔

۲۰-۱۱-۱۹۶۰ء　　　　تمہارا وقت، تمہارا جیتی

تصور کے جھروکے سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ تم خاموش ہو، مرجھائے ہوئے۔ تم تو تب

بھی مجھ سے سب باتیں کر لیا کرتی تھیں، جب میں تمہارا کچھ بھی نہ لگتا تھا۔ اب تو تمہارا بہت کچھ ہوں، جنم ہی سے بالکل تمہارا۔ صرف کچھ دنوں سے غیر۔ یہ خاموشی ایک اندھیرے کی طرح میرے تصور پر چھا جاتی ہے۔ کئی بار تو بہت دیر تک کھڑکی کے باہر کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ تم مجھے نظر بھر کر کب دیکھو گی؟ میری روشنی میری جانب کب دیکھے گی؟ میں اور میرا تصور کب روشن ہوں گے؟

۲۱-۱۱-۱۹۶۰ء

صبح

میں اس خاموش اندھیرے میں اور نہیں رہ سکتا۔ ۲۸ تاریخ، سوموار صبح ساڑھے دس بجے میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ تمہیں، اپنی روشنی کو لینے کے لئے۔ تمہارے بغیر اپنی خودی بھی بے جان لگتی ہے، بے معنی۔ جو کچھ بھی ہوں، اچھا یا برا، تمہارا ہوں۔ تم جو کچھ بھی ہو، میری ہو، میری امانت، میری خوبصورت شام۔ جہاں بھی رہو، مجھے اپنے ساتھ شمار کرو۔ اب کوئی الگ نہیں رہے گا۔

۲۱-۱۱-۱۹۶۰ء

شام، چار بجے

تمہارا امر، تمہارا وقت — جیتی

زندگی تمہیں ایک اجنبی موڑ پر لے آئی ہے۔ تم خاموش ہو، میرے ساتھ، سب کے ساتھ اور اب میں خاموش ہوں، اپنے آپ کے ساتھ آنکھیں بند کرتا ہوں۔ تمہیں آشی کے روپ میں دیکھنے کے لئے، لیکن نہ آنکھیں بند ہو رہی ہیں اور نہ کچھ دکھائی دے رہا ہے نہ میں تمہیں اجنبی کے روپ میں دیکھ رہا ہوں، نہ خود کو۔

۲۳-۱۱-۱۹۶۰ء

• قصور میرا ہے، میں تمہیں اکیلی چھوڑ آیا- میرا یہ احساسِ جرم روز بروز بڑھتا جا رہا ہے شاید تمہاری پریشانی سے بھی زیادہ .... لیکن .... :

۲۵-۱۱-۱۹۶۰ء

تمہاری نظمیں، تمہارے افسانے، تمہارے ناول، تمہاری فائلیں، تمہاری ساڑھیاں تمہاری قمیضیں، تمہاری چوڑیاں، تمہارے پرس، تمہاری تصویریں، تمہارا جلیتی، ادھوری بنیان: ہم سب ادھورے ہی رہے ہیں- صبح ساڑھے دس بجے ڈی لکس سے ہم نئی دلی کے اسٹیشن پر پہنچ جائیں گے اور تم سے ملنے کے لئے تمہیں دیکھنے کے لئے وہاں انتظار کریں گے- خود آکر لے جانا ہمیں- جب تک تم نہیں لے جاؤ گی، ہم وہیں اسٹیشن پر تمہارا انتظار کرتے رہیں گے ......

میں جیبی، کبھی سارا تمہارا اپنا، اب ایک اپنا اجنبی تم سے مخاطب ہوں- کبھی بمبئی آتے وقت تم نے تین دن مانگے تھے، آج میں مانگ رہا ہوں- جو کچھ تمہیں دینا ہے، اب دینا ہے —— چاہے تین دن دو، چاہے تین پہر، چاہے تین گھنٹے، چاہے تین منٹ ہی ......

۲۹-۱۱-۱۹۶۰ء

رات کی روشنی تم، دن کا اندھیرا میں- پاک ہنڈ یا تم، گیلی لکڑیاں میں- میری شکست کی کہانی، میری محبت کی بات اور کانٹے کانٹے اپنے من کی قمیض میں ہی تو ہوں- اپنی شکست کی کہانی پڑھ کر، سنبھال کر رکھ لی ہے جیسے تمہارے محبت نامے رکھتا تھا، جیسے تمہاری تصویریں رکھتا ہوں- میں ٹریڈ مارک بناتا تھا- لیکن محبت کی قبر کی تصویر کا جو افسانہ تم نے لکھا ہے، جو میرے نام معنون ہے، تم لکھ کر کیا نہیں کر رہیں؟ لیکن تم اتنا پیار رکھتی ہو

کہ میں سب درد سہہ جاتا ہوں......

۲۴-۱۲-۱۹۶۰ء

تم زندگی سے ناراض ہو۔ میری بھول کی اتنی سزا، آشی! بہت زیادہ ہے یہ تو! یہ دس سال کا بن باس، نہیں نہیں میرے ساتھ ایسا نہ کرو۔ مجھے آباد کر کے ویران نہ کرو۔

۲۶-۱۲-۱۹۶۰ء —— جلتی تمہارا

وہ میز، وہ دراز، وہ رنگوں کی شیشیاں اسی طرح ہر روز تمہارے لمس کا انتظار کرتی ہیں جو اُن سے پیار کرتی تھی، جو اُن کی چمک تھی۔ وہ برش، وہ رنگ اب بھی اُس چہرہ کو، اُس پیشانی کو تلاش کرتے ہیں۔ اُس کا انتظار کرتے ہیں جس کے ماتھے کا سنگار بن کر وہ تروتازہ رہتے تھے، ورنہ وہ اب تک سوکھ گئے ہوتے۔ تمہارے انتظار کا پانی ڈال کر میں انہیں سوکھنے نہیں دے رہا۔ لیکن اُن کی تازگی تمہاری پیشانی سے ہے، تم جانتی ہو، تازگی! میں تو تمہارا انتظار کر رہا ہوں، رنگوں میں بھی، زندگی میں بھی۔

۱-۱-۱۹۶۱ء

تمہارے دو خط مل گئے۔ پہلے خط میں تمہاری نظم ملی، تمہارے درد کی نظم، "اپنے درد کی نظم" جو ہر پل تم جی رہی ہو، میں جی رہا ہوں۔ دوسرے خط میں تمہارا مراسلہ ملا۔ آنکھیں بھر آئیں اور دس برس، پیر ڈھلک پڑیں۔ دس برس میرے رنگ، میں، اور میز کی دراز اپنے کواڑ کھولے تمہاری راہ دیکھتی رہے گی۔ آج کا تمہارا خط تمہارا ایک فیصلہ ہے تمہارے درد کا اور یہ تمہاری محبت کی طرح مجھے قبول ہے۔ دس برس کا یہ طویل، تلخ انتظار اپنی حد اور اپنی ملاقات لے کر مجھے بُلا رہا ہے۔ خدا حافظ!

۲-۱-۱۹۶۱ء

تمہارا دس برس کا یہ سراپ آج مجھے ایک عطیہ سالگ رہا ہے۔میری آنکھوں کے سامنے سے اندھیرا سمٹ رہا ہے اور روشنی کی چمکتی ہوئی کرنیں دکھائی دے رہی ہیں۔ دس برس کی اونچی دیوار پر۔ آج میرے خیالوں کو راہ مل گئی ہے، منزل کا کھویا ہوا پتہ مل گیا ہے۔ اس جنون پر، اس یگانگت پر، اس اعتماد پہ ایک دس برس تو کیا۔ کئی دس برس قربان کئے جا سکتے ہیں۔

۱-۲-۱۹۶۱ء

شب

ایک باغ میں تھا، تمہارے ساتھ۔ زرد پھولوں کے ایک پیڑ تلے تمہارے ساتھ لیٹا تھا۔ لال پرس سر کے نیچے تھا۔ دس سال دھیرے دھیرے گزر رہے تھے۔ پھر ایک تیکھی سی آواز آئی۔ میں چونک کر اٹھا۔ دروازہ کی گھنٹی بج رہی تھی۔ تار آیا۔ تمہارا تار۔ تمہارا نام پڑھ کر ایک دم کچھ ہوا۔ تیزی سے جیسے وہ دس سال کا گزرنے والا راستہ اب سرعت سے گزر گیا ہو۔ اور تمہاری ملاقات مجھے جگا رہی ہو۔ "اٹھو! تمہاری رات ختم ہوگئی ہے"، یوں ہوتا ہے، مجھے کئی بار لگتا ہے، میں اپنے کندھے پر کئی بار وہ جگہ دیکھتا ہوں، جہاں چوم چوم کر تم نشان ڈال دیا کرتی تھیں۔ باہر تو وہ اب وہ نشان کہیں نہیں ملتا۔ لیکن اندر، کہیں دُور اندرون میں محسوس ہوتا ہے .... میں اپنی آتشی کو ڈھونڈتا ہوں۔ وہ کالا چلتی بھی تمہیں ڈھونڈتا ہے، جیسے کبھی کسی اور شے کی تلاش تھی۔ وہ اب آزاد ہے، لیکن اسے اب کسی اور شے کی تلاش نہیں۔ کسی اور شے کی تلاش نہیں۔ اب وہ شرمسار ہے، لیکن تم دیکھ لینا، اب اس کا رنگ کالا نہیں ہے وہ آتشی کے رنگ کا ہوگیا ہے....

۹-۱-۱۹۶۱ء

آشی! کل ٹائمز والوں سے پھر بات ہوئی تھی۔ پے کا فیصلہ نہیں ہو رہا۔ میں پندرہ سو مانگتا ہوں۔ وہ بارہ سو تک تیار ہوئے ہیں۔ لیکن انہیں میرا کام بہت پسند ہے۔ کل انہوں نے سارا پرنٹنگ ڈیپارٹمنٹ دکھایا۔ کیسے ایک گھنٹے میں اُن کی مشین بیس ہزار کاپیاں چھاپ کر ری پخ کر کے تیار کر دیتی ہے۔ لیکن کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے مجھے تمہارے بغیر۔ تم یہاں ہوتیں تو خوشی سے سارا گھر بھر جاتا۔ جب بھی میرے نام کی قدر ہوتی ہے۔ مجھے تمہاری فخر اور غرور سے بھری آنکھوں کی تلاش ہوتی ہے اور اس تلاش میں خود گم ہو کر رہ جاتا ہوں۔ جب بھی کوئی حسین شے، حسین نظر، حسین عورت اور حسین بچہ دیکھتا ہوں، ایک درد سا میرے اندرون میں سما جاتا ہے۔ لگتا ہے اندر باہر ایک اندھیرا سا پھیل رہا ہے۔ اس درد، اس اندھیرے پر غصہ بھی آتا ہے اُس وقت جی میں آتا ہے، بھول جاؤں، سب کچھ بھول جاؤں، تمہیں بھی بھول جاؤں لیکن اس طرح بھلانے پر تم اور بھی یاد آنے لگتی ہو۔

آشی! عقل اور امتیاز کیا سب کچھ کھو دینے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے؟ کیوں؟ جب ویران ہو گیا، مجھے اپنی محبت کی ریئلائزیشن آئی۔ آشی! یہ بڑا ظلم ہے۔ دس سال کے لئے اندھیرا نہ کرو میری نگاہوں کے سامنے، میرے ہاتھوں کے سامنے میرے سب کچھ کے سامنے۔ کون جانتا ہے، زندگی میں یہی دس سال باقی ہوں!

میں نے جان لیا ہے، پہچان لیا ہے، سب کچھ کھو کر۔ اب شعور، پہچان، ریئلائزیشن سب کچھ آ چکا ہے۔ تم بھی آ جاؤ۔

۱۱-۱-۱۹۶۱ء اپنے سب کچھ کے انتظار میں — جیتی

دنیا میں کیا کچھ دلفریب ہے بہلانے کے لئے۔ لیکن پانے کے لئے صرف وہی ہے، جو میں نے تم میں دیکھا تھا۔ تمہارے سوا اور کہیں، کبھی نظر نہیں آیا۔ لیکن تمہیں وہ دل کیسے دکھاؤں، جس میں اور کچھ ٹھہرتا ہی نہیں؟ تمہارے تصور کے سامنے کچھ بھی تو نہیں ٹھہرتا—

اور تم ۔۔۔ کہاں چلی گئیں؟

۱۵-۱-۱۹۶۱ء

تم نے کوئی نئی چیز تو ضرور لکھی ہو گی۔ مجھے کیوں نہ بھیجی؟ میں انتظار کر رہا ہوں۔ میرا کام، میری صحت، میری آمدن میرے خیالات جیسے سب کچھ رک سا گیا ہے جیسے یہ سبھی کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔

مجھے خود معلوم نہ تھا کہ کوئی کسی کے لئے اس طرح سوچ سکتا ہے، تڑپ سکتا ہے، بندھ سکتا ہے ۔۔۔ کسی ایک کے ساتھ۔ زندہ رہنے بغیر سچائی کبھی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ لیکن کیا اب کچھ گنوا کر ہار کر ہی عقل آتی ہے؟ اور پھر صرف عقل ہی سے تو زندہ نہیں رہا جا سکتا، لیکن اگر یہ عقل سب کچھ واپس نہیں لا سکتی تو عقل کا ہے کی۔۔۔۔

۱۸-۱-۱۹۶۱ء

حسن اور شباب سے یہ شہر، یہ دنیا بھری پڑی ہے۔ کاروبار کی بھی کوئی کمی نہیں۔ یہاں مجھ جیسے کام کرنے والے آرٹسٹ کے لئے۔ لیکن کسی حسن کی جانب کشش محسوس نہیں ہوتی۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ جیسے سب کچھ بھٹکن بن کر رہ گیا ہو مرے لئے۔

آشی! اب شعور، اپنے آپ کی پہچان ملی ہے اب وہ میچورٹی ملی ہے اس سفرنگ کے باعث، جس کا تم ہمیشہ انتظار کیا کرتی تھیں۔ کن فلکٹ گیا تو میچورٹی آئی۔ سفرنگ آئی تو شعور ملا۔ تم گئیں تو تمہاری قدر جانی۔

میرے ساتھ تم اس طرح خاموش نہ ہو جایا کرو۔ اب مجھ سے کوئی بات ایسی نہ ہو گی۔ جو تمہیں بری لگے، جس سے تمہیں کوئی تکلیف ہو۔ میں نے تمہیں ہمیشہ اپنا آپ بتایا ہے (اپنے کان فلکٹ بھی بتا دیا کرتا تھا) اب تم مجھے سمجھ لو۔ تمہارے سوا مجھے اور کون سمجھ سکتا ہے؟ کسی

اور کے سمجھنے کی مجھے ضرورت بھی نہیں۔ صرف تم سمجھ لو، میری آشی! اپنے جیتی کو......

۲۴-۱-۱۹۶۱ء

آشی!

مجھے کیا معلوم تھا کہ تم، صرف تم، میری کشش کا مرکز ہو! تم ہی میری کشش کا مرکز رہو گی! میں اپنی خطا تسلیم کرتا ہوں، لیکن تم اپنا ظلم کبھی نہ لوٹاؤ گی؟ کب تک؟ اس ظلم کی تپش سے خود کو کب تک بچا سکو گی؟ کیا میرے خاموش رہنے تک؟؟

۲۷-۱-۱۹۶۱ء   تمہارا، اپنے مرکز کا ___ جیتی

کبھی میرا گھر تھا، اب نہیں ہے، اس کا مجھے احساس ہوتا ہے، جب تم مجھے بہت یاد آتی ہو۔ کتنے خواب بُنے! کتنا اعتماد تھا، ان سب کو پورا کر لیں گے! اعتماد اب بھی ہے۔ مگر پورا کچھ بھی نہیں ہوا۔ کیا خواب بُننے والے صرف خواب ہی دیکھ سکتے ہیں، حقیقت نہیں؟ میں نہیں مانتا۔ میں خواب بن سکتا ہوں۔ تو حقیقت بھی بُن سکتا ہوں۔ میں خواب نہیں، ایک حقیقت ہوں۔ ایک ٹھوس حقیقت، ایک تلخ حقیقت، ایک اٹل حقیقت...... (اور تم بھی) حقیقت کی قسمت! دیکھو، مجھے اپنے ادھورے پن پر کتنا غصہ آتا ہے! لیکن یہ غصہ انسان کے لئے ایک چیلنج بن جاتا ہے اور پھر اُس انسان کا سب کچھ جاگ اُٹھتا ہے۔ وقت ہمیشہ انتظار کرتا ہے۔ یہ ملاقات ضرور ہو گی......

۲۷-۱-۱۹۶۱ء

ایک فلم کا کوئی منظر اس وقت یاد آتا ہے۔ رسّی کے سہارے چل کر ایک اندھی لڑکی اپنے بستر تک پہنچ رہی ہے۔ اسی کا ایک سرا اُس کے بستر سے اور دوسرا غسل خانہ کے دروازہ

سے بندھا ہے۔ تمہاری کشش کی غیر مرئی رسّی کا سہارا لے کر میں بھی چلا جا رہا ہوں کشش کی اس رسی کا ایک سرا محبت ہے، ۵ ستمبر ۱۹۶۰ء سے اور دوسرا دس سال کے تاریک راستہ کے پار، ۵ ستمبر ۱۹۷۰ء سے بندھا ہے۔ ملاقات کی کشش نے نہ جانے میرے اندرون میں کیسی روشنی کر دی ہے۔ اب کسی اندھیرے کی پرواہ نہیں، گویا۔ یہ دس سال کی تاریکی، تاریکی نہ ہو، ایک راستہ ہو، اپنے گھر تک کا سیدھا راستہ، جس کے دروازے پر تم کھڑی راہ تک رہی ہو، جس پر میں چلا آ رہا ہوں ـــــ اپنی عورت کا مرد، اپنے بخت کا وقت، اپنی آتنی کا جیتی....

۴-۲-۱۹۶۱ء

سٹیشن پر اوتّار[1] کو چھوڑ کر ابھی لوٹ رہا ہوں۔ تمہارا خط ملا ہے۔ نظریں جھک گئی ہیں۔ سر جھک گیا ہے۔ مرد کی عورت جھک گئی ہے۔ میرے اندرون کا سب کچھ جھکا دو رہا ہے صرف یہی جی چاہتا ہے۔ اس طرح بار بار جھکنے سے یہ نظریں، یہ مرد اور مرد کا سب کچھ ہمیشہ کے لئے جھک جائے، ختم ہو جائے....

۸-۲-۱۹۶۱ء   تمہارا زخم، اپنا اندھیرا ـــ جیتی

دوست بیگم!

یہ ناول[2] تم نے کب امریکہ جا کر لکھا تھا؟ میں یہ ناول اس طرح پڑھ رہا ہوں، گویا اپنی قسمت کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ قسمت کسی ایشور کی نہیں، کسی شاعر کی بنائی ہوئی ہے۔ تمہارے سوا اسے بنا بھی کون سکتا تھا؟ زہے قسمت!

۱۳-۲-۱۹۶۱ء   تمہارا ـــ جیتی

---

[1] میرا چھوٹا بھائی۔

[2] آئن رینڈ کا ناول "فاونٹین ہیڈ"، جو امرتا نے مجھے خط کے بجائے ارسال کیا تھا۔

نو سو میل کا جو فاصلہ دکھائی دیتا تھا، اب نظر نہیں آ رہا، لیکن جو نظر نہیں آتا، رہے گا۔ تو وہ فاصلہ ہی۔ ہمیشہ ایک جیتی جاگتی، غیر فانی کشش دے گا۔

۲۲-۲-۱۹۶۱ء ——— جیتی

امرتا جب بھی یورپ جاتی، میں روزی کی تلاش میں بمبئی چلا جاتا تھا۔ میرے ذیل کے خطوط انہی ایام کے ہیں جب وہ یوگوسلاویہ گئی تھی:

آج صبح منوج[1] کا فون آیا تھا۔ اُس سے ملنے کے لئے میں اُس کے ہوٹل میں گیا۔ دورانِ گفتگو میں بات چل پڑی پنجابی فلمیں بنانے کی، پنجاب جیسی ٹھوس اور پنجابیوں جیسی سچی فلمیں اور پھر بات تمہارے ناول 'پنجر' پر آ گئی۔ منوج یہ ناول پڑھ چکا ہے۔ میں نے ایک بار پھر اپنے الفاظ میں اس کی کہانی سنائی ——— کرداروں کی تخلیق، گھٹن، ماحول اور پھر اُس ماحول میں جس پنجابی کلچر کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ منوج بڑی سنجیدگی سے سنتا، سمجھتا اور پوچھتا رہا۔ بات چلتی دکھائی دے رہی تھی۔ اِدھر بھوپی[2] کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں گھر لوٹ آیا۔ گھر آ کر تم سے باتیں کرنے لگا، کبھی اپنے کمرہ میں بیٹھ کر، کبھی تمہارے کمرہ میں کھڑا ہو کر۔ میں دیکھ رہا تھا پوری[3] کو، ٹاٹ پر بیٹھی پھلیوں سے مٹر نکالتی ہوئی۔ رشید کو اُسے گھوڑی پر بٹھا کر لے جاتے ہوئے اور سن رہا تھا ——— کئی آوازیں وارث شاہ کو پکار رہی ہیں۔

۹-۸-۱۹۶۷ء ——— جیتی

---

[1] فلمساز اور اداکار منوج کمار

[2] امرتا کی بیٹی کندلا

[3] پوری اور رشید، 'پنجر' کے دو کردار

ماجا!

ان تین مہینوں کے لئے گھر کی ذمہ داریاں ہم پر چھوڑ دو۔ یہ تین مہینے امرتا کے ساتھ امرتا کے ہیں، جو صرف مصنف ہے، محض مصنف۔ بھوپی ویسے ہی ہے بالکل ۔۔ بہت پیاری۔ اس انکل میں ممی جمع ہو گئی ہے۔ جمع کا یہ احساس بہت نیا اور انوکھا ہے۔ جیتی کی طرح میں دن بھر کام کرتا ہوں اور دن بھر گھر پر رہتا ہوں۔ گھر کے لئے اور اپنی دونوں بیٹیوں[1] کے لئے میرا ہر خط تمہارے نام ایک ٹوسٹ ہوگا۔

۲۳-۸-۱۹۶۷ء ۔۔۔۔ جیتی

امرتا جب ہنگری میں تھی تو اس کی سالگرہ پر یہ خط لکھا تھا:

آج کا آنگن بھرا ہوا ہے سارے موسموں سے، موسموں کے سارے رنگوں سے اور تمہاری خوشبو ہے۔ سبھی تہواروں سے۔ سارے ادب سے اور ساری پاکیزگی سے۔ ۳۶۵ آفتابوں سے۔ میں نصف صدی کے سارے آفتاب لے کر' آج' کو، ۳۱ اگست کو، تمہاری ذات کو ٹوسٹ دے رہا ہوں ۔۔۔ صدی کے آنے والے کبھی آفتابوں کا۔

۳۱، اگست ۱۹۶۷ء ۔۔۔۔ جیتی

شاعرہ!

تم کسی مخصوص سرزمین، کسی خاص ملک یا زبان یا قوم کو بی لونگ نہیں کرتیں۔ تم بی لونگ کرتی ہو ہر اس زمین کو، جہاں دھرتی دل کی طرح وسیع ہوتی ہے اور جذبات سے مہکتی ہے۔ تم بی لونگ کرتی ہو۔ اس ملک کو جہاں کلچر اور ادب دن رات ترقی پذیر ہیں۔

---

[1] کندلا اور ماہنامہ ناگ منی،

ہر طرح کی حد بندیوں سے آزاد۔ تم بی لونگ کرتی ہو اُس پُر زبان کو، جنہیں دلوں کی آواز سننا آتی ہے، دیکھنا بھی اور پہچاننا بھی۔ تم بی لونگ کرتی ہو اُس قوم کو، جس کے لوگ ماضی میں ڈوب نہیں جاتے، فقط آج، میں سانس لیتے ہیں اور آج کی طرح ہی اپنے آپ میں جیتے ہیں اور دوسروں کے ساتھ بستے ہیں اور تم بی لونگ کرتی ہو۔ ہر اُس رات اور دن کو، جہاں ہر رات ایک نئی ادبی تخلیق کو کوکھ میں ڈال کر سوتی ہے اور ہر صبح ایک نیا گیت گاتی دن کی سیڑھیاں چڑھتی ہے۔

ماجا! تمہیں رومانیہ بھی جانا ہے اور ویسٹ جرمنی بھی، جہاں لوگ تمہیں بڑے ادب اور عزت سے بلا رہے ہیں۔ تم مجھ سے ملنے کے لئے وہاں بے قرار ہو اور میں تم سے ملنے کے لئے یہاں۔ اسی بیقراری کے روپ میں، میں تمہیں وہاں ہر جگہ، ہر ملک، ہر شہر اور ہر محفل میں ملوں گا۔ تم جہاں بھی ہو گی، میں وہیں آ جاؤں گا۔ اقرار کی حد سے ادھر اب میرے لئے نئے نئے نام ہوں گے، جن کا تلفظ شاید تمہارے لئے مشکل ہو، لیکن جنہیں پہچاننے میں تمہیں کوئی مشکل نہ ہو گی۔ ہر نئی عمارت میں میری صورت کو اور ہر پرانے گرجا گھر میں میرے نقوش پا کو تم فوراً پہچان لو گی۔ ہر پھول میں میرے رنگ اور ہوا کے ہر جھونکے میں میری مہک کو پہچان سکو گی۔ ہر جھیل میں میری گہرائی اور ہر دریا سے میری روانی کو جان سکو گی۔ ہر نظم کے نئے خیال سے اور ہر گیت کی دھڑکتی لَے سے میں تمہاری طرف بار بار دیکھوں گا۔

ماجا! میں تمہیں کبھی تھکنے نہ دوں گا۔ ہر صبح ایک امنگ بن کر میں تمہاری آنکھوں میں جاگوں گا۔ اور جینے کے لئے دھڑکتی ہوئی روین کر دن میں تمہارے پاؤں میں چلوں گا۔

شاعرہ! تمہیں طہران بھی جانا ہے، فارسی کی امیر ترین شاعری کے گہوارہ میں عمر خیام اور اُس کی رباعیات سے تابندہ اور چمکتے ہوئے ملک میں کسی بہ نشین آرچ میں کھڑی جب تم عمر خیام کے بارے میں سوچ رہی ہو گی۔ میں اُس کی رباعیوں میں ایک اور رباعی کا اضافہ

ہوتا دیکھ رہا ہوں گا۔ میری آخرو چھیل! تم کیا جانو، یہاں ایک سمندر تمہارے سامنے آ رہا ہے۔

۲-۹-۱۹۶۷ء —— جینتی

ماجا!

تمہارے خط کے انتظار میں سوچ رہا ہوں کہ میں ایک ساز ہوں۔ دن آتا ہے اور میرے تاروں کو —— ایک ایک تار کو جگا دیتا ہے۔ لیکن رات کو محفل میں کوئی نہیں جگاتا، کوئی نہیں جلتا۔ میں تیس دن سے یہ ظلم جی رہا ہوں۔ ایک ساز کی صورت میں، خاموشی کا، ایک مشرق کی صورت میں (سورج کے طلوع نہ ہونے کا، ایک رات کی صورت میں، ایک گیت کے نہ ہونے کا، ایک دن کی صورت میں، ایک رکی ہوئی زندگی کا۔

میرے آفتاب! تم مغرب سے کب لوٹو گے؟ تمہیں کیا معلوم، ایک مہینہ ہو گیا۔ یہاں ایک دن بھی نہیں چڑھا، ایک طویل رات چل رہی ہے —— تین مہینے لمبی رات!

....

ابھی تمہارا خط ملا، ہنگری کے نیلے آسمانی کاغذ میں —— جیسے ایک آفتاب طلوع ہو گیا ہو......

۹-۹-۱۹۶۷ء —— جینتی

ایک آفتاب آسمان پر طلوع ہوتا ہے، عام سورج، ساری دھرتی کا مشترکہ سورج، جس کی روشنی میں دھرتی پر سب کچھ دکھائی دینے لگتا ہے، جس کی تپش سے سب کچھ جیتا ہے، جنمتا ہے، پھلتا ہے۔ لیکن ایک سورج دھرتی پر بھی اُگتا ہے، خاص سورج، ایک

من کی دھرتی کا سورج - صرف ایک من کے لئے - اس سے ایک بات ایک رشتہ بن جاتی ہے ایک خیال، ایک تخلیق، ایک خواب: ایک حقیقت - اس سورج کی صورت ایک انسان کی ہوتی ہے - انسان کی کئی صورتوں کی طرح اس کے بھی کئی روپ ہو سکتے ہیں - عام طور پر وہ سورج ایک ہی دھرتی کے لئے ہوتا ہے - لیکن آسمان کے سورج کی طرح کئی بار عام بھی ہو سکتا ہے - سب کے لئے - تب وہ دیوتا، گورو یا پیغمبر کے روپ میں آتا ہے -

میں نے پہلی بار اس سورج کو ایک مصنفہ کے روپ میں دیکھا تھا، ایک شاعرہ کے روپ میں - قسمت کہو یا سنجوگ، میں نے ڈھونڈ کر اسے اپنا لیا ——— ایک عورت کے روپ میں، ایک دوست کے روپ میں، ایک آرٹسٹ کے روپ میں اور ایک محبوبہ کے روپ میں -

۱۳-۹-۱۹۶۷ء ——— جیتی

ماجا!

چاروں طرف دنیا ایک ایسے انبوہ کی صورت میں دکھائی دے رہی ہے جو سچائی کو کسی گنگا میں زندہ بہا آئی ہو، یا کہیں دفن کر آئی ہو، اور اب اس سچائی کی سمادھ کی، مقبرہ کی سبھی پوجا کر رہے ہوں، زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہوں - ہر نظر میں، ہر بات اور ہر رشتہ میں، ہر انسان میں سچائی کی اس سمادھ، سچائی کے اس مقبرہ کی پرچھائیں نظر آ رہی ہے - عجیب بات ہے انہیں لاش قبول ہے، زندگی نہیں -

ایک زمانہ تھا، جب کوئی رشتہ پیدا کرتے وقت، کوئی کام، کوئی دھندا شروع کرتے وقت اور کچھ بھی کرتے وقت ہم لوگ بسم اللہ کہا کرتے تھے - لیکن آج کمپرومائز کی بات سن رہے ہیں، کہہ رہے ہیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ کمپرومائز کمزوری اور خوف کی پیداوار ہے -

زندگی ایک ایسا پھول بنتی جا رہی ہے، جس پر وقت کا گرد و غبار پڑا ہو اور جو نگاہ کی شبنم سے خالی ہو۔

۹-۱۰-۱۹۶۷ء —— جینتی

میں اکیلا بیٹھا تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ تم ویسٹ جرمنی پہنچ رہی ہو گی۔ میرے خیالوں کا حساب سنو —— ویسٹ جرمنی + ۱۰ دن + امرتا: ایک حسین سفر۔

مھوپی آج گھر میں ساڑھی پہن کر یوں پھر رہی ہے جیسے کسی ننھی چڑیا کے اچانک پنکھ اُگ آئے ہوں اور اسی تبدیلی کے باعث اس سے ایک جگہ ٹک کر بیٹھا نہ جا سکے۔ وہ اپنے بوائے فرینڈ کا انتظار کر رہی ہے۔ کبھی پانی پیتی ہے، کبھی برآمدہ میں جا کر باہر کی طرف دیکھنے لگتی ہے، کبھی کمرہ میں آئینہ کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے، جیسے خود کو بار بار دیکھنے پر مجبور ہو، پنکھوں سمیت۔ تو یہ رہا آج کا حساب —— شباب + پنکھ + خواب + انتظار = ایک کمیڈنس

خطوں کے ذریعہ باتیں کرنے کا آج یہ آخری سلسلہ ہے۔ جب تمہیں یہ خط ملے گا۔ تم واپسی کی تیاریاں کر رہی ہو گی، گھر لوٹنے کی۔ میں موم بتیاں لگا کر دیوالی کا انتظار کروں گا —— اپنی دیوالی کا —— جو لوگوں کی یکم کی دیوالی کے تین دن بعد آئے گی۔ تمہاری آمد پر یہ موم بتیاں فوراً روشن ہو جائیں گی، یہ گھر جگمگا اُٹھے گا۔ میں جاگ اُٹھوں گا۔ میری ذات جھلملانے لگے گی۔

۲۱-۱۰-۱۹۶۷ء —— جینتی

آج یہ دنیا مجھے ایک بہت بڑے اخبار کی طرح نظر آ رہی ہے اور ہر شخص اس دنیا کے اخبار کے الگ الگ حروف کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ اس اخبار کے ہیڈنگ سے لے کر

پرنٹ لائن تک سارے حروف ایک عجیب سی گھبراہٹ سے محصور کھڑے ہیں ــــ اور اب یہ ایکشن، ری ایکشن کی عجیب و غریب بھیڑ بن چکی ہے۔ اگر ایک حرف کسی چوٹی کی بات کرتا ہے تو ہزاروں حروف کسی تاریک خندق کی بھیانک خبر سناتے ہیں۔ اگر ایک حرف کسی چاند پہ پہنچنے کے خواب کی تکمیل میں منہمک ہے تو ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں حروف ایٹم بموں سے ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں میل تک ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں خوابوں کو ملیا میٹ کر ڈالنے کا دعویٰ کر رہے ہیں اگر محبت کی بات کرتا ایک حرف امرتا پریتم بنتا ہے، شعر بنتا ہے تو کروڑوں حروف نفرت کا پرچار کرنے لگتے ہیں ــــ نفرت کا گرنتھ اور نفرت کا قرآن اٹھائے پھر رہے ہیں۔ میرا بس چلے تو میں اس اخبار کے سبھی حروف مٹا کر صرف ایک لفظ لکھ دوں ــــ امرتا ــــ جو دیکھتے دیکھتے ایک نظم بن جائے اور پھر پھیل کر ساری عبارت: ایک تمدن مشرق سے مغرب تک۔

بن باس[1]

۶-۱۲-۱۹۶۷ء ــــ جیتی

ایک پروڈیوسر کے پاس بیٹھا تھا۔ باتیں ہو رہی تھیں فلموں کی۔ کہانی سے لے کر پیش کرنے تک کی۔ باتوں کو جیسے کسی اچھی کہانی کی پیاس لگ رہی تھی بھوک لگ رہی تھی اور پھر وہ پیاس، وہ بھوک کہانی کی تلاش میں نکل پڑی تھی اور چلتے چلتے امرتا کے پاس پہنچ گئی تھی ــــ امرتا سے ڈاکٹر دیو تک، پھر پنجر تک، پھر چیک نمبر ۳۶ تک پروڈیوسر عقلمند سا لگتا تھا اور سوجھ بوجھ والا بھی۔ اُس نے ڈیزائن بنانے کے لئے بلایا تھا۔

---

[1] گھر سے دور بمبئی جا کر رہنے کو میں 'بن باس' کہا کرتا تھا۔ وہاں کام کی تلاش میں بھٹکنا بھی ہوتا تھا اور اداس رہنا بھی۔

تمہارا ناول پڑھنے کے بعد کون جانے، یہ کون جانے، میرے شوق کا پتہ بن جائے اور پھر یہ پتہ میرے خواب کا پتہ بن جائے اور پھر یہ میرا بن باس میری اجودھیا میں تبدیل ہو جائے اور میری زندگی کا ہر لمحہ تمہارا رام راج ہو جائے۔۔۔۔۔

بن باس

۹ - ۱۲ - ۱۹۶۷ء —— جینتی

شام کا وقت تھا۔ آفتاب آہستہ آہستہ سمندر میں اترتا نظر آرہا تھا اور سارا ماحول دھندلا سا گلابی سا، گویا دھیمے سروں میں دن کا آخری گیت گا رہا تھا —— وہ گیت جو جب ختم ہوتا ہے۔ تو اس سے ایک نیا گیت جنم لے لیتا ہے اور آئندہ کے ایک نئے گیت کی آمد تک زندہ رہتا ہے۔

کار میں بیٹھے ہیں اور بتن یہ سب کچھ دیکھتے، سنتے اور سراہتے مینا کماری کے مکان کی طرف جا رہے تھے۔ جوہو کی ایک سڑک تھی، خاموش اور چاروں طرف سے ناریل کے پیڑوں سے گھری ہوئی، شام کے سارے حسن سے مزین اور مہکتی ہوئی مینا کا گھر سمندر کے کنارے ایک کاٹیج ہے، خاموش اور سادہ سی۔ مینا ہمیں اپنے کمرہ میں لے گئی۔ بتن اپنی فلم کے کچھ سین اس سے ڈسکس کرنے لگا۔ میں کمرہ کی ہر شے کو دیکھ رہا تھا، جانچ رہا تھا، ہر شے مینا کے مزاج کی غماز تھی۔ تمہارا ایک ناول 'پنجر' مینا نے پڑھا ہے اور وہ اس سے اتنی امپرسڈ ہے —— فدا ہو جانے کی حد تک امپرسڈ ہے۔

اب صبح کا وقت ہے اور میری بیداری ایک خط سے دن کا آغاز کر رہی ہے۔ یہ دن ایک جدوجہد میں ختم ہوتا ہے، یہ دن خط کو تم تک پہنچاتا ہے اور جدوجہد کو ایک خواب تک۔

بن باس

۱۱ - ۱۲ - ۱۹۶۷ء —— جینتی

کل کا یہ شہر ایک ڈر میں سانس لے رہا ہے۔ آج بھی اس شہر کی حالت کل ہی کی طرح ڈری، سہمی ہوئی ہے۔ کل کے زلزلے سے خوف زدہ لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر پارکوں میں رات گذار رہے ہیں۔ اوپر کی بہت سی منزلیں خالی ہو چکی ہیں۔ اسی شہر کو جہاں سے سب سے زیادہ بجلی ملتی تھی، وہاں بہت نقصان ہوا ہے۔ سارا قصبہ ہی ڈھے گیا ہے۔ بجلی بند ہو جانے سے شہر کے سب سینما گھر، سٹوڈیو، کارخانے اور ملیں نصف سے زیادہ بند ہیں۔ لیکن انسان کی روز بروز مسمار ہوتی انسانیت کسی کو نظر نہیں آ رہی۔ صرف اُس کا آج ایک خوف کے ماحول میں سانس لے رہا ہے۔ یہ خوف فضا میں پھیل چکا ہے۔ ہر جھوٹ سے ہر سچائی تک، ہر تاریکی سے لے کر ہر اجالے تک، ہر اجنبی سے لے کر ہر یگانے تک، ہر کالکھ سے لے کر ہر فن تک، ہر جنگ سے لے کر ہر صلح تک، ہر ویرانی سے لے کر ہر آبادی تک، ہر قید سے ہر آزادی تک، ہر گناہ سے ہر ثواب تک، ہر شیطان سے ہر خدا تک، ہر جہالت سے ہر علم تک انسانیت اور تہذیب کی عمارت کی ایک ایک اینٹ لحہ بہ لحہ گر رہی ہے، جیسے ان کے نیچے کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہوں — احساس کی بنیادیں، حسن اور پاکیزگی کی بنیادیں سا جا! یہ کیا ٹریجڈی ہے کہ انسان اس دھرتی پر سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں پا رہا! اور چاند پر جا کر بھی اُس کی تلاش بھی بھٹک کر رہ گئی ہے —— نظر سے لے کر احساس تک کی۔

بن باس

۱۳-۱۲-۱۹۶۷ء —— جیتی

میری قوم! نیا سال مبارک! میری دوست! نیا سال مبارک! میری نظر! نیا سال مبارک! میرے نقطہ نظر! نیا سال مبارک! میرے فن! نیا سال مبارک! میرے ماحول! نیا سال مبارک! میرے ایمان! نیا سال مبارک! میری حقیقت! نیا سال مبارک! میرے سکہ شمے! نیا سال مبارک! میری ماجا! نیا سال مبارک! میرے خدا! نیا سال مبارک!

۳۱-۱۲-۱۹۶۷ء —— جیتی

چاروں طرف ایک شور سا رچ گیا ہے، چیخوں سی مسرتوں کا شور، جو ایک دھند کی طرح چاروں جانب پھیل رہا ہے، سر سے پاؤں تک، قدموں سے سوچ تک، جھونپڑی سے سکائی سکیپر تک، مٹی سے چاند ستاروں تک، نگاہ سے نقطۂ نگاہ تک، قاعدہ سے قرآن بائبل اور گرنتھ تک اور اوپن سائنس سے زندگی تک۔ اس شور میں زندگی کی نظم پراگندہ ہوتی جارہی ہے۔ ہر نظم کاغذ کی صلیب پہ لٹکتی خاموش نظر آتی ہے ہر تصویر کینوس میں پھنسی بے رنگ سی دکھائی دیتی ہے۔ ہر کن ہماری آرزوؤں کے کھنڈر میں دب گیا لگ رہا ہے۔ اس شور میں کھڑا میں اس میں شامل نہ ہوتے ہوئے بھی شامل ہوں اور نئے سال کے شروع ہونے کی آواز سن رہا ہوں۔ لیکن یہ آواز مبارک باد کی نہیں ہے۔ میرے اندرون سے مبارک کا نقطہ ابھی باہر نہیں آرہا۔ نئے سال اور مبارک باد کے بیچ اس شور کا فاصلہ حائل ہے۔

۱-۱-۱۹۶۸ء ——— جیتی

ایک تاریک رات میں کھڑا اپنا راستہ تلاش کر رہا ہوں، راستہ جو میرے اپنے پاؤں کے نیچے ہے۔ ایک ویران شہر میں کھڑا اپنا سپنا ڈھونڈ رہا ہوں، سپنا جو میری ذات کے اندر ہے۔ ایک خالی آسمان کے سامنے کھڑا اپنا تصور ڈھونڈ رہا ہوں، تصور جو میرے اپنے خیالوں میں موجود ہے۔ بیتے ہوئے کل نام کی ایک بستی میں کھڑا اپنا آج ڈھونڈ رہا ہوں، آج جو میری اپنی نظر میں ہے۔ لیکن میں باہر کھڑا کیا تلاش کر رہا ہوں ——— کہاں اور کیوں؟ جب کہ میرے اپنے سوا کہیں بھی، کچھ بھی میرا نہیں ہے!

۴-۱-۱۹۶۸ء ——— جیتی

ایک راستہ، ثابت و سالم راستہ، آج اپنے ہی قدموں سے بکھرتا جا رہا ہے۔
شبنم کا ایک قطرہ، متبسم، شگفتہ، آج اپنی ہی آنکھ آنسو بنتا جا رہا ہے۔

ایک جہاں خوشبو کا، اپنے ہی اندرون سے محصور، آج جیسے دھواں سا بنتا جا رہا ہے۔
ایک انقلاب، فی النفسہٖ مکمل، آج، خیر سا، خود بخود مرتا جا رہا ہے۔
ایک ہوُن کار، تہ دار ارتقا کا آج مذہب کی طرح اُن ہونکار، اپنے آپ میں سکڑتی جا رہی ہے۔
ایک خیال، ہر سانس کے ساتھ نو بہ نو، آج ایشور کی طرح ہر لمحہ باسی ہوتا جا رہا ہے۔
ایک صبح، بن دوپہر کی، مہک سے محروم، آج جیسے ڈھلتی جا رہی ہے۔
ایک نظر، نقطۂ نظر جیسی، آج نظروں کے اژدحام میں جیسے اندھی ہوتی جا رہی ہے۔
ایک فقرہ، پورے علم جیسا، آج اکیلا، اجنبی، جیسے ختم ہوتا جا رہا ہے۔

۷-۱-۱۹۶۸ء —جینتی

مسجد کے احاطہ میں ایک آدمی شیشے میں دیکھ کر خدا کی تصویر بناتا پکڑا گیا۔ اس کی سیلف پورٹریٹ پھاڑ کر اُس کے گلے میں ڈال دی گئی اور اُسے عمر بھر کے لئے اپنے آپ میں جلاوطن کر دیا گیا۔
گرجا گھر میں عیسٰی صلیب سے اتر کر گنگناتا ہوا کپڑے پہن رہا تھا اور باہر کی جانب دیکھ رہا تھا۔ باہر دن کے اندھیرے میں اپنے سبھی کپڑوں سمیت صلیب پر لٹکتی ایک دنیا کامل خاموش دکھائی دے رہی تھی۔
جب سے بھگوان کہیں گنگا میں بہہ گیا ہے، لوگوں نے مرنے سے قطعاً انکار کر دیا ہے صرف کسی تصویر، نظم یا فن کی موت کی خبر کبھی کبھی سنائی دے جاتی ہے۔

۸-۱-۱۹۶۸ء —جینتی

جوں جوں میں اپنے آپ کی طرح چلتا جا رہا ہوں، اس اپنے شہر میں ہر سانس کے ساتھ اکیلا ہوتا جاتا ہوں۔ میری اس تنہائی کے درمیان تمہارے دو خط اکھڑے ہوئے ہیں۔ ابھی

تک کوئی مکان، کوئی کمرہ نہیں ملا۔ خانہ بدوشوں کی طرح اِدھر اُدھر پھر رہا ہوں۔ مکان مل بھی گیا، تو بھی میں ایک خانہ بدوش کی طرح اُس میں رہ رہا ہوں گا۔ آباد ہونے کے لئے دھرتی کی تلاش کرنا ہے۔ ماجا! مجھ اور تم جیسے لوگ ان مکانوں، شہروں اور ملکوں میں رہتے ہوئے بھی خانہ بدوش ہیں۔ ہم سدا آباد ہونے کے قابل دھرتی کی تلاش کے بارے میں سوچتے ہیں۔ یہ تلاش ہمارے فعل میں ہے، ہماری ذات میں ہے۔ یہی تلاش ہماری خانہ بدوشی ہے۔

یہ فلمی دنیا ایک عجیب غیر مرئی چکر میں سانس لے رہی ہے، جی رہی ہے۔ اُکھڑی اُکھڑی سانس اور اُکھڑی اُکھڑی زندگی۔ ان سیکیورٹی سے باکس آفس تک، فیل ہو جانے سے فیم تک ہر خوف کا چکر انہیں چکرائے جا رہا ہے ان کی نظروں، ان کے خیالوں کو، ان کے قدموں کو، ان کے اعتقادوں کو اور ان کے کاموں کو۔ اس چکرائی ہوئی حالت کی پیداوار ہم ہر روز دیکھتے ہیں، سنتے ہیں، پڑھتے ہیں بے سرو پا خیال، بے سرو پا کہانی —— اس بے سرو پا کے سر اور پاؤں کی مجھے تلاش ہے، تمہیں تلاش ہے میرا ہر رنگ، تمہارا ہر لفظ —— یہی تلاش ہے۔ اسی ادھورے پن کے خلاف ہماری ریزسٹنس ہے۔ اس ریزسٹنس کا تلاش اور جدوجہد کا ایک روپ ”ناگ“ ہے —— تمہارے الفاظ اور میری لکیروں کی جدوجہد کی ایک ہُونکار۔

۱۰-۱-۱۹۶۸ء —— جیتی

کل کی کینوس ایک رات کی طرح آسمان کے ایزل پر اداس کھڑی ہے اور رنگ تاروں کی مانند بکھرے اپنا راستہ تلاش کر رہے ہیں۔ وقت ایک فریم کی طرح لاچار، اپنی فطرت کے خلاف، جیسے ہر راستہ کی حدود بنا سمٹتا جا رہا ہے۔ اب میں اور میرا برش، پاؤں کی رفتار اور دماغ میں فکر بکھڑے لمحہ بہ لمحہ تھکتے جا رہے ہیں......

۱۳-۱-۱۹۶۸ء —— جیتی

آج یہ کیسی بددعا ہے —— بہار اپنے پتوں، پھولوں، پھلوں سے زندگی کے پیڑ کو دیمک کی طرح کھوکھلا کرنے لگی ہے۔

۱۴-۱-۱۹۶۸ء —— جینتی

میری زدہ بی! میری موتر اشیدہ! پچھلی شب سے میں خلیل جبران سے پڑھ رہی ہوں، خلیل جبران جس نے گیارہ سال پہلے میرے اندرون کے مرد کو جھنجھوڑا تھا، بیدار کیا تھا، للکارا تھا۔ اپنی بات کہتا وہ سب کی بات کہہ جاتا ہے، بڑی سادگی سے، قدرتی انداز میں ——

Love is the only freedom in the world.

۲۸-۹-۱۹۶۸ء —— امروز

پچھلے قریباً تیس سال کے دوران میں لوگوں کے خطوط کے جواب میں امرتا نے بے شمار خط لکھے ہوں گے۔ آج اُن خطوں کی نقول پیدا کرنا ممکن نہیں۔ ان، کچھ خطوط کی نقلیں فائل میں ملی ہیں اور کچھ کی اُن لوگوں سے، جنہیں خط لکھے گئے تھے۔ وہ خطوط اس طرح ہیں۔

'ناگ منی' کا افتتاحی شمارہ شائع ہوا تو امرتا نے اپنی سہیلی اوتار کو لکھا:

میری اوتار!

تمہارا پتہ تلاش کر رہی تھی۔ عجیب اتفاق ہے، تمہارا ہی خط تمہارا پتہ بتانے آگیا (کاش، دنیا میں اکثر ایسا ہو جایا کرے، تمہارے ساتھ، میرے ساتھ، سب کے ساتھ!) پنجابی کا ایک پرچہ شروع کر رہی ہوں (خود مصنف، خود مدیر، خود ناشر) اس کا نام ہے 'ناگ منی'

لے اندریٹہ کانگڑہ کا ایک پہاڑی گاؤں ہے۔ جہاں میں اور امرتا پنجاب کے مشہور مصور سوبھا سنگھ سے ملنے گئے تھے۔ ہم اُن دنوں خلیل جبران پڑھ رہے تھے۔

پہلا شمارہ پریس میں دے دیا ہے۔ اس کی اولین خریدار بھی میں ہی ہوں۔ دوسرا خریدار اندرجیت تمہارا نام میں نے پہلے خریداروں میں شامل کر لیا ہے اس لئے تم اس کے ایک سال کے بارہ شماروں کی قیمت مبلغ چھ روپیہ بذریعہ منی آرڈر ارسال کر دو۔ پرچہ دیکھنے کے بعد اگر مناسب سمجھو تو اپنے گردو نواح کے، جان پہچان کے لوگوں سے اسے متعارف کرادو۔ خیر! یہی وجہ تھی کہ میں تمہارا پتہ ڈھونڈ رہی تھی۔ باقی اپنے لئے تو مجھے کبھی تمہارا پتہ تلاش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ کیونکہ وہ کبھی مجھ سے گم نہیں ہوا۔ اس بار دلّی آ کر تم نے جو مجھے خود سے دُور رہنے کے لئے کہا تھا۔ اُس کا کارن مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ اب تم گم ہو کر بھی گم نہیں ہو سکتیں۔ تمہارے اندرون کا حسن وہ شئے ہے، جیسے دیکھنے، پہچاننے اور اپنی گرفت میں لینے کے لئے ہم لوگ نظمیں لکھتے ہیں، افسانے تراشتے ہیں.....

۸-۴-۱۹۶۶ء تمہاری ــــــ امرتا

ایک بار امرتا پنجابی نظموں کا ایک مجموعہ مرتب کر رہی تھی۔ موہن سنگھ کی نظمیں اس مجموعہ میں شامل کرنے کے لئے اُن نے مصنف سے اجازت مانگی اور ایک خط لکھا۔ موہن سنگھ نے انکار کر دیا۔ تب امرتا نے موہن سنگھ کے نام یہ خط لکھا:

شری موہن سنگھ جی!

تسلیم کرتی ہوں کہ آپ پنجابی شاعری کے تاجدار ہیں، لیکن اپنے ہم پیشہ معاصرین سے بھی اس قدر کنجوسی کہ نظمیں چھاپنے کی اجازت مانگی تو جواب میں اپنے خزانہ کا تالا دکھا دیا۔ خشک "نہ"، پنجابی زبان کے مزاج کے خلاف لگی تو آپ نے میرے خط کا جواب انگریزی میں دیا!!

جنگ لگنے والی ہے۔ چیزوں کے بھاؤ چڑھ رہے ہیں۔ لیکن شاہ جی! میری اور آپ کی نظموں کے بھاؤ نہ چڑھنے پائیں گے۔ بادشاہو! ہم نے اس دھرتی پر کون سے جھنڈے

گاڑ نے ہیں پنچھیوں کی طرح دھرتی کی شاخوں پہ بیٹھ کہ دو چار گیت گا ئیں گے ــــ دلوں کی ہُوک کے گیت ــ اور اُڑ جائیں گے۔ اس دھرتی سے اور کیا لینا ہے ہم نے ؟ آگے آپ کی مرضی!......

۳-۱۲-۱۹۷۱ء ــــ امرتا پریتم

رسیدی ٹکٹ، میں امرتا نے لکھا ہے کہ کلونت سنگھ ورک زندگی میں اُس سے بہت کم ملے ہیں ۔ بہت کم بار ۔ اُن کا خط بھی شاذ ہی کبھی آیا ہوگا۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو دوپہر کی ڈاک سے امرتا کے نام ورکؔ کا مرسلہ ایک پارسل آیا۔ میں نے پارسل کھولا ۔ ایک رنگین شال دیکھ کر میں نے امرتا کو آواز دی۔ "لو! قسم کھانے کو تمہارا ایک ہم عصر ابھی ہے"۔ امرتا نے اس شال کے جواب میں ورکؔ کے نام جو خط لکھا اس کی نقل میں نے رکھ لی تھی:

وِرک!

میرے سبھی ہم عصر اگر مجھے علیحدہ علیحدہ گالیاں دینے کے بجائے ایک ساتھ مل کر بھی صلواتیں سنانے لگیں تو مجھے رُلا نہیں سکتے ۔ لیکن تم نے اپنی اچھائی سے مجھے رلا دیا! دوست! پنجابی پرچوں کو کھول کر کالے حروف اور کالے معانی دیکھنے کی مجھے عادت سی ہو گئی ہے ۔ لیکن کوئی پیکٹ کھول کر خوبصورت رنگ دیکھنے کی ابھی عادی نہیں ہوئی ہوں ۔ اس وقت امروز میرے کندھوں پر شال کو پلیٹ کر دیکھ رہا ہے اور میں ہاتھ میں کاغذ لئے نمناک آنکھوں سے تمہیں یہ خط لکھ رہی ہوں......

۱۸-۱۰-۱۹۷۶ء ــــ امرتا

ناگ منی ، میں ایک کالم شروع کیا گیا " وہ گھڑی ، وہ گھنٹہ" ، اُس کے لئے پریم گورکھی

نے ایک واقعہ لکھ کر بھیجا ــــ ۱۹۶۷ء میں کسی نے اُس کی مشکیں کسوا کر پولیس کی حراست میں دے دیا تھا۔ پولیس نے اُسے گالیاں دیں اور پٹائی بھی کی۔ اُس کا قصور صرف یہ تھا کہ اُسے جس لڑکی سے عشق تھا اُس کے باپ کو وہ پسند نہ تھا اُس پر سائیکل کی چوری کا بے بنیاد الزام لگایا گیا۔ پولیس کی پٹائی سے بچانے کے لئے گورکھی کے والد نے ۵۰۰ روپیہ کی رشوت بھی دی۔ پٹائی تو خیر کم ہو گئی، لیکن مقدمہ تین سال تک چلتا رہا۔ ان تین سالوں میں اُس کے اندر جذبۂ انتقام نے سر اٹھایا۔ غنڈوں کے ہاں جا جا کر وہ تلوار چلانا سیکھتا رہا۔ اُس کے اندر کا انسان بدل گیا۔ کتابیں بالائے طاق چلی گئیں۔ لیکن اُس انسان کے علاوہ اُس کے اندر ایک مصنف بھی تھا۔ اُس نے ایک کہانی لکھی اور "ناگ منی" میں اشاعت کے لئے امرتا کو بھیج دی۔ اُس کے اپنے الفاظ میں ــــ "امید تو نہ تھی، مگر بات ہی الٹ گئی۔ محبت سے لبریز امرتا کا ایک خط مجھے ملا۔ میں نے خط چھاتی سے بھینچ لیا، چوما اور دہلیز کے پاس کھڑے کھڑے میری آنکھیں اُمڈ آئیں۔ لکھا تھا، ہیلو پریم! تمہاری کہانی بہت خوبصورت ہے، تمہارے اندر ایک فنکار ہے، تم اُسے مرنے نہ دینا..... تم بہت حسین کہانیاں لکھو گے..... کبھی مایوس نہ ہونا..... بہت بہت پیار... اور بھی بہت کچھ تھا، لیکن میرے لئے یہی ہفت اقلیم تھی۔ دو تین کہانیاں "ناگ منی" میں چھپ گئیں تو میرے اندر ایک اور انسان جاگ اُٹھا اور مجھے کیا سوجھی، میں نے ایک مختصر سا خط حاکم کے نام لکھ ڈالا: جج صاحب! آپ کا فیصلہ سننے کے لیے ایک ملزم کے روپ میں آپ کے روبرو میں ۱۵ اکتوبر کو پیش ہو جاؤں گا۔ نہیں چاہتا، مجھے سزا ملے۔ جناب مہربان! مجھے کہانیاں لکھنے اور پڑھنے کا شوق ہے۔ میں زندگی میں ایک اعلیٰ مصنف بننا چاہتا ہوں۔ میرے اس خط سے منسلکہ مشہور مصنفہ امرتا پریتم کے میرے نام ایک خط سے

آپ کو میرے بارے میں معلوم ہو جائے گا۔ میں ایک بار پھر عرض کروں گا کہ آپ مجھ پر رحم کیجئے۔ آپ کا دو لفظوں کا فیصلہ میری زندگی کو سنوار سکتا ہے اور برباد بھی کر سکتا ہے، اور میں نے اس کے ساتھ امرتا پریتم کا خط منسلک کر کے ڈاک کے سپرد کر دیا۔ جج کا نام جی۔ کے گوئل تھا۔ فیصلہ کے دن وہ ٹکٹکی لگائے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس نے کہا میرے پاس آؤ۔ کٹہرے کے ادھر گھوم کر میں جج صاحب کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں بھینچ لیا اور کہا۔ میں تمہیں ایک عظیم مصنف دیکھنا چاہتا ہوں خوب لکھو.... اور پھر کلرک کی جانب متوجہ ہو کر بولا۔ پریم داس دلدار جن دیو یری!"

پریم گورکھی کی یہ تحریر پڑھ کر امرتا کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ اُس نے فوراً پریم کو ایک خط لکھا۔ اُس کی نقل میرے پاس ہے،

پیارے پریم گورکھی!

آج میں نے تمہیں 'پیارے'، کا لفظ فقط ابتدائی تخاطب کے طور پر ہی نہیں لکھا۔ ابھی تمہارا ارسال کیا مضمون وہی گھڑی، وہی گھنٹہ، پڑھا اور اُس کے جواب میں 'پیارے' اپنے صحیح معنی میں لکھ رہی ہوں۔

تمہارا یہ مضمون 'ناگ منی' کے جنوری کے شمارہ میں شائع ہو گا۔ سچ مانو، دوست! دنیا کی برائی کا صحیح بدلہ نیکی ہی ہے۔ انتقام کے لفظ کو دنیا نے بڑا خوفناک بنا دیا ہے مگر وہ دراصل خوفناک نہیں۔ اُس کا ہونا بہت ضروری ہے۔ بشرطیکہ وہ صحیح معنوں میں ہو۔

اسی طرح نفرت، غصّہ اور بغاوت بھی بڑے اہم جذبے ہیں، انسان کی صحیح قوت لیکن آج تک ان کا صحیح استعمال نہیں ہوا۔ دنیا کی سبھی غلط قدروں کے خلاف انہیں استعمال کیا جانا چاہیئے، لیکن انہیں ہمیشہ اپنے غرور کی حفاظت کے لئے برتا جاتا رہا ہے یا صرف

اختیار کے حصول کے لئے۔

ظلم کا بدلہ لوٹ مار یا تشدد نہیں ہو سکتا۔ اس کا صحیح بدلہ انسانی نیکی ہے۔ لیکن یہ کام آسان نہیں، بہت مشکل ہے۔ اس کے لئے ریاض کی ضرورت ہے۔ لیکن جسے ہاتھ میں قلم لینا ہو، ریاض اُس کی اولیں شرط ہے۔

تمہارے اس مضمون کے لئے بہت بہت پیار!

۹-۱۰-۱۹۷۶ء — امرتا پریتم

مئی ۱۹۶۶ء میں امرتا نے پنجابی ماہنامہ ’ناگ منی‘ شروع کیا تھا۔ امرتا کو اس وقت کس شئے کی ضرورت تھی اور اُس کا نقطہ نظر کیا تھا، یہ جاننے کے لئے اُس کے افتتاحی اداریتی مضمون کا مطالعہ ضروری ہے۔ اسی خیال سے وہ مضمون اس مجموعہ میں شامل کیا جا رہا ہے:

شعبدہ ایک ایسا واقعہ ہوتا ہے جو تصور سے ایک اِنچ اُدھر رونما ہوتا ہے اور تصور حقیقت سے ایک اِنچ اُدھر ہوتا ہے۔ دو اِنچ کا یہ فاصلہ ہر انسان کی عمر سے لمبا ہوتا ہے کیونکہ ہر حقیقت جب کچھ چاہتے ہوئے تصور کے مقام پر پہنچتی ہے تو تصور اُس سے ایک اِنچ آگے بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح جب تصور جب اپنا راستہ طے کر کے شعبدہ کے مقام پر پہنچتا ہے تو شعبدہ اُس سے ایک اِنچ آگے بڑھ جاتا ہے۔

انسان کی اب تک کی تاریخ اور مستقبل کی تاریخ کے درمیان یہی دو اِنچ کا فاصلہ ہے جو بیک وقت طے شدہ بھی ہے اور طے ہونے والا بھی۔ اس میں طے شدہ راستہ کا اطمینان بھی ہے اور غیر طے شدہ کا درد بھی۔ یہ دونوں رجحانات ایک دوسرے کی تمنا ہیں۔ تمنا انسان کی قوت ہے۔ یہی اُس کی ہر تخلیق کا راز ہے اور یہی راز انسان کا ارتقا ہے۔

’ناگ منی‘، اسی ارتقا کی علامت ہے، اُس راز، اُس قوت اور اُس تمنا کی، جس سے

مصنف نو یہ تو تخلیق کرتا ہے اور قاری نو یہ تو مطالعہ کرتا ہے۔ اچھے مصنّف تخلیق کا معیار بلند کرتے ہیں اور اچھے قارئین مطالعہ کا معیار اُوپر اُٹھاتے ہیں اور اس طرح تخلیق اور مطالعہ کا سفر ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

انہی ہم سفر مصنفوں اور قارئین کی ضرورت سے ناگ منی، معرضِ وجود میں آیا ہے۔ جو طے شدہ راستہ کے اطمینان سے اُوبتے ہیں، بلکہ غیر طے شدہ کی تمنا کرتے ہیں اور اُس کے درد کے اظہار کے لئے کسی ذریعہ کے متلاشی ہیں۔ ناگ منی، ایسا ہی ایک ذریعہ ہے۔ پہلے درد کے اظہار کے لئے، پھر دریافتوں کی بنا پر اُسے اطمینان میں تبدیل کرنے کے لئے اور پھر نئے درد کے اظہار کے لئے۔

دلّی ریڈیو پر دیوندر نے ایک بار امرتا کا انٹرویو لیا تھا۔ بعد میں اُس نے یہ انٹرویو ایک طویل ملاقات کی صورت میں اپنی تصنیف قلم کار (ت) میں شامل کر لیا۔ یہ تصنیف پہلی بار ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعض حصّے اس طرح ہیں:

امرتا: سب سے پہلا تجربہ؟ وہ ناپختہ عمر کی الہڑ تخلیق تھی۔

دیوندر: اور اُس کے بعد؟

امرتا: اُس کے بعد فطرت بھول گئی کہ میں گوشت پوست کی زندہ چیز ہوں۔ اُس نے مجھے ایک اچھی سی مشین سمجھ لیا۔ بس ایک حادثہ میرے اندر ڈال دیا اور ایک تصنیف وہاں سے نکال لی۔

دیوندر: اُس کے اس ظلم میں رحم کا امتزاج بھی ہوتا ہے، خواہ ظلم فنکار کے لئے ہو اور رحم دیگر لوگوں کے لئے۔

امرتا: صرف لوگوں کے لئے نہیں، خود فنکار کے لئے بھی۔ جیسے دھیرے دھیرے ہیں

اپنی کہانیوں کے کردار حقیقی دکھائی دینے لگتے ہیں، ہم خود، کہانیوں کے اصل کردار مرور وقت سے اپنی ہی نظروں میں فرضی بن جاتے ہیں۔ ہماری تحریریں صحیح معنوں میں ہمارے دکھ درد میں شریک ہو جاتی ہیں۔ دھیرے دھیرے ہم یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ یہ حادثہ ہمارے ساتھ نہ بیتا تھا، ہماری کہانی کے کسی کردار کو پیش آیا تھا؛ کسی کمی کو، کسی ریکھا کو، کسی لیکھا کو۔ اس طرح ہم اپنی کہانیوں میں اپنے بجائے جو بھی نام لاتے ہیں، وہ ہمارے درد کو سہہ لیتا ہے۔ دراصل اس سے آگے حادثہ سے دو چار ہونا اور ذرا فاصلہ پر کھڑا ہو کر اُسے دیکھنا بھی ایک عجیب تجربہ ہے۔

دیوندر: پنجابی تنقید کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

امرتا: تنقید ایک بڑی بلند چیز ہے۔ اس کا علم اور استعمال معمولی لوگوں کے بس کا روگ نہیں نقاد کے پاس دو ہتھیاروں کا ہونا ضروری ہے: وسیع علم کی تلوار اور جاذبیت کی سپر۔ میں نقاد اُسے کہوں گی، جس کی تحریریں پڑھ کر دھرتی کی بہت سی زمین مصنف کے خوابوں کی حدود میں آجائے.....

دیوندر: آپ نے جب ایک گیتوں والے، کتاب لکھی تھی تو اُسے پڑھ کئی افسانے تراشے گئے۔ کئی لوگوں نے اپنا نام آپ کے ساتھ وابستہ کرنا چاہا تھا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی کہانیاں کئی جگہ آج بھی دہرائی جا رہی ہیں۔

امرتا: دھاندلی کے اس زمانہ میں سب سے آسان بات ہے کسی عورت کے ساتھ جو جی میں آئے وابستہ کر دینا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی کہانیاں آج بھی سنگریزوں کی طرح میرے بدن میں چبھ رہی ہیں۔ جب کبھی تہذیب کا زمانہ آئے گا، حقیقت کو یوں مجروح نہ کیا جا سکے گا۔ آج اگرچہ سائنس بہت دور نکل چکی ہے، میں اسے تہذیب کا زمانہ نہیں کہہ سکتی۔ تہذیب کا زمانہ تب آئے گا، جب عورت کی رضامندی کے بغیر اُس کا نام بھی ہونٹوں پہ نہ لایا جا سکے گا۔ موجودہ زمانہ میں تو لوگ مصنف بھی ڈنڈے

کے زور سے بننا چاہتے ہیں اور عاشق بھی ڈنڈے کے زور سے۔

دیوندر: آپ نے بیوپار جیسی نظم لکھی تھی ؎

جسماں دا بیوپار

تکھڑی دے دو چھابیاں وانگ

اک مرد، اک نار

روز تولدے ماس[1]

یہ آپ کی ایک بڑی جرأت تھی۔

امرتا: کیا کیا جائے، کھوپڑی میں لکھ کی بددعا لے کر پیدا ہوئی ہوں۔ ہماری دنیا میں ایک بازار تو وہ ہے، جہاں جسموں کا سودا رات کی سیاہی کی اوٹ میں ہوتا ہے اور دوسرا بازار ہے شادی، جب وہ سودا دن دہاڑے ہوتا ہے۔

دیوندر: آپ کی نظم دہر باڑے کی بھیڑیں، مذہبی قدروں پہ کتنا گہرا طنز تھی!

امرتا: پال گوگاں نے اپنی موت سے کچھ روز پہلے ایک دوست سے کہا تھا کہ میں نے اپنی آدھی زندگی صرف ایک خیال کو پورا کرنے میں صرف کر دی۔ وہ خیال تھا۔ جرأت، فن کے ارتقاء کے لئے جرأت بنیادی چیز ہے۔ پال گاں کو آدھی زندگی لگانا پڑی، شاید اس لئے کہ بہت سی جرأت اُسے سماج نے پہلے دے دی تھی، کیونکہ وہ ایک مرد تھا۔ لیکن مجھے تو ساری زندگی صرف کرنا پڑے گی: آدھی تو عورت ہونے سے اور باقی آدھی فنکار ہونے کی وجہ سے۔

دیوندر: میرا خیال ہے، صرف جسمانی حسن آپ کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتا۔

---

[1] جسموں کی تجارت، ترازو کے دو پلڑوں کی طرح، ایک مرد اور ایک عورت ہر روز اپنا گوشت تولتے ہیں۔

امرتا: کرشن چندر کی کہی ایک بات یاد آتی ہے کہ صرف جسمانی حسن ایک مختصر افسانہ جیسا ہے جو ایک ہی نشست میں ختم ہو جاتا ہے.....

دیوندر: اور ذہنی حسن؟

امرتا: میرے خیال میں وقت کی تاریخ، جس کا کوئی باب آخری نہیں ہوتا.....

کئی اخباروں میں امرتا کے انٹرویو شائع ہوئے تھے۔ ان سے امرتا کے بعض ایسے فقروں کا انتخاب کر رہا ہوں۔ جو اس کے نقطہ نگاہ پر روشنی ڈالتے ہیں اور یہی نقطہ نگاہ اس کی شخصیت ہے:

میں اس قدر انفرادیت پسند ہوں کہ ایک مارکس شاعرہ کبھی نہیں ہو سکتی۔

—— سٹیٹسمن: ۲۴ مئی ۱۹۶۸ء

× × ×

مصنف تجربوں کو اپنے اندر جذب کرتا ہے اور پھر انہیں اپنے تخیل کے ساتھ تحلیل کر کے لکھتا ہے۔ مثلاً ایک بار میں نے حرامی بچوں کے بارے میں ایک ناول لکھا۔ مجھے کسی لاڈ پیار سے بھرے گھر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں کے نچوں کے چہرے میری یادوں میں جاگزیں ہو گئے۔ کئی سال بیت گئے۔ تب میں نے ایک ناول لکھا اس وقت ناول کے کردار میرے ذہن میں ارتقا پا کر حقیقت بن چکے تھے۔

—— سٹیٹسمن: ۱۳ دسمبر ۱۹۷۰ء

× × ×

ان ملعون انعامات کے باعث دنیائے فن میں کورپشن پھیل رہی ہے۔

—— ویمنٹ لائن: ستمبر ۱۹۷۳ء

× × ×

جب میں آزادی کی بات کرتی ہوں تو میرا فقط سماجی اور معاشی آزادی نہیں ہوتا۔ بلکہ فکر، ذمہ دارانہ رویہ اور اصولوں کی آزادی سے ہوتا ہے۔ اگر ایک مصنف کی حیثیت سے اپنے مشن کا اظہار کرنا چاہوں تو میں کہوں گی یہ ہے ایک سفرنامہ انّا سے عظیم تر انا تک۔

——— ایلوزوبکلی: ۶ دسمبر ۱۹۷۵ء

× × ×

میں محسوس کرتی ہوں کہ کوئی لڑکی جب کوئی فیصلہ کرے، اُسے عملی صورت دینے کے لئے پوری جرأت سے کام لے، جو بھی اُس کا ایمان دایقان ہو، اُس پر ثابت قدم رہے۔ کسی بھی منزل پر خارجی دباؤ سے سمجھوتہ نہ کرے۔ خارجی قوتوں سے خوف زدہ ہوئے بغیر وہ جو بات بھی مناسب سمجھے اُس پر عمل پیرا ہو۔

——— یوا بھارت: جنوری ۱۹۷۶ء

× × ×

میں اپنی تحریروں میں ترمیم نہیں کیا کرتی۔ وہی لکھتی ہوں، جو لکھنا چاہتی ہوں۔ اگر کوئی قاری میری تحریروں سے اپنی ذہنی وابستگی محسوس کرتا ہے، تو پڑھے، ورنہ کونہ میں ڈال دے۔ ایک بار ایک امریکی مصنف نے ساہتیہ اکاڈمی میں تقریر کی موضوع تھا 'مصنف اپنی تحریر کو ہر دلعزیز کیسے بنا سکتا ہے۔ اُس کا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں قارئین کے اذہان کو ٹٹولنا چاہیئے کہ اُن کے مطالبات کیا ہیں اور اپنی تحریروں کو اُن کے مطابق تراشنا چاہیئے۔ میرا خیال ہے، جو مصنف ایسا کرتا ہے، وہ سرے سے مصنف ہی نہیں۔ میں فوراً چلی آئی۔ میں ایسی مصنفہ نہیں بننا چاہتی۔ ہرگز نہیں۔ شکریہ!

——— سن ڈے: ۵ دسمبر ۱۹۷۶ء

× × ×

اگست ۱۹۷۲ء میں سٹ روگا (یوگوسلاویہ) کے جشن شعر میں امرتا سے لئے گئے انٹرویو کے کچھ اقتباسات:

سوال: امرتا جی! آپ نے ادب کو بہت حد تک سوریئلی سمجھا ہے۔ کیا زندگی میں آپ نے کوئی شے غیر سوریئلی بھی دیکھی ہے؟

امرتا: اپنے نقادوں کو۔

سوال: آپ کے خیال میں دنیا میں شاعری کا کیا رول ہے۔

امرتا: ماحول میں ایک شعوری بیداری پیدا کرنے کے علاوہ کسی خاص موقعہ پر شاعری کا رول بہت اہم ہو جاتا ہے۔ تقسیم وطن کے موقعہ پر جب لاکھوں بے گناہ، بے زبان لوگ موت کے گھاٹ اتارے جا رہے تھے، مذہبی جنون زہر کی طرح پھیل رہا تھا۔ زندگی کی عام قدریں ختم ہو گئیں۔ اُس وقت حدود کو چیر کر اور مذہبی امتیازات سے اوپر اُٹھ کر جو آوازیں سنی گئیں وہ تھیں قلم کی آوازیں......

سوال: آپ کے نزدیک آزادی کے کیا معنی ہیں؟

امرتا: وہ صورت حالات جس میں ایک عام انسان زندگی کا مفہوم پا سکے، لیکن جس میں کسی کی انفرادیت ختم نہ ہو جائے۔

اشتراکی ممالک میں تین تین ہفتے رہنے کے بعد امرتا پیرس بھی گئی تھی اور پھر لنڈن گئی۔ وہاں اکتوبر ۱۹۷۲ء میں بی بی سی سے نشر ہوئے ایک انٹرویو کے اقتباسات:

سوال: تو امرتا جی! آپ نے اس سفر میں دونوں طرح کے نظام دیکھے۔ آپ کس نظام کو ترجیح دیتی ہیں؟

امرتا: کوئی بھی نظام پرفیکٹ نہیں۔ میرا خیال ہے، ہم لوگ موجودہ نظام سے ایک بہتر نظام کے متلاشی ہیں۔ سوشلزم میں کئی خوبیاں ہیں تو کئی خامیاں بھی۔

سوال: اگر ہندوستان میں سوشلزم آگیا تو؟

امرتا: ہمارے ہاں ڈیموکریسی کی روائت ہے۔ ہمارا سوشلزم لازمی طور پر کچھ الگ قسم کا ہوگا....

لنڈن ٹیلی ویژن پر دکھلائے ایک انٹرویو کے کچھ حصے:

؟: یہاں مغرب میں عورتیں اپنے حقوق کے بارے میں بہت بیدار ہیں۔ لیکن بہت سال پہلے جب آپ نے "جنم داتا" عنوان کی نظم لکھی تھی، آپ پر بغاوت کا الزام عائد ہوا تھا۔

امرتا: میں اس الزام کو قبول کرتی ہوں۔

؟: ہندوستان نے آزادی کے بعد کیا ترقی کی ہے؟

امرتا: ہم نے بہت کچھ حاصل کر لیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کچھ کہہ سکنے کا موقع حاصل کیا ہے۔ ترقی بھی ضرور ہوئی ہے۔ لیکن غریبی اور بیروزگاری کے مسئلے بڑے سنگین ہیں۔

؟: کچھ حقیقتوں سے شاعروں نے فرار کیا ہے؟

امرتا: ہرگز نہیں۔ وہ طنز کرتے ہیں تو اپنا حق سمجھ کر مایوس ہوتے ہیں تو کسی امید سے وابستہ ہو کر....

دلی ٹیلی ویژن سے نشر ہوئے ایک انٹرویو سے:

ریوتی شرن شرما: امرتا جی! آپ کے ناولوں کے نسوانی کردار مکمل حقیقت کی زندگی میں سانس لینا چاہتے ہیں اور اس کے لئے وہ بسے بسائے گھر توڑ ڈالتے ہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا، ان ناولوں کو پڑھ کر کئی گھر واقعی نہ ٹوٹ گئے ہوں گے؟

امرتا: ممکن ہے ٹوٹ گئے ہوں۔ مگر ریوتی صاحب! آج تک جتنے بھی گھر ٹوٹے، باطل کے ہاتھوں ٹوٹے۔ اب کچھ گھر حق کے ہاتھوں بھی تو ٹوٹ لینے دیجئے۔

بلغاریہ میں مصنفین کی ایک ضیافت کے موقع پر میزبان کو ایک مورپنکھی پیش

کہتے ہوئے امرتا نے ٹومنٹ دیا۔ "دنیا میں امن کے نام۔ یہ رنگین پرندے ہمارے دیس کے قومی پرندے ہیں۔ ہم دنیا میں امن چاہتے ہیں تاکہ ہمارا قومی پرندہ دنیا کے آنگن میں رقص کر سکے۔"

امرتا نے وقتاً فوقتاً جو مضامین لکھے تھے، وہ پہلے "ناگ منی" میں شائع ہوتے رہے، پھر کتابی صورت میں منظر عام پر آئے۔ کتاب کا عنوان ہے "سفرنامہ" اس کتاب کے بارے میں امرتا نے کہا ہے کہ یہ "کتابوں، ملاقاتوں اور خیالوں کی سڑک کا سفرنامہ" ہے۔ اسی کتاب کی بعض منتخبہ سطور حسب ذیل ہیں:

دھرتی بہت وسیع ہے۔ یہاں ہر قوم، نسل، مذہب اور اعتقادات کے لوگ امن و سکون سے آباد رہ سکتے ہیں۔ یہاں کسی کو جنگی ہتھیار بنانے کی ضرورت نہ ہونا چاہیئے۔ یہ دھرتی بہت زرخیز بھی ہے۔ کسی انسان کو بھوکے سونے کی نوبت نہ آنا چاہیئے۔ زندگی ایک بہتے پانی کا نام ہے۔ اس کا کوئی لمحہ جوہڑ کے پانی کی طرح رکا ہوا، لڑتا ہوا نہ ہونا چاہیئے۔ محبت ایک روشنی کا نام ہے، ایشور کے نام جیسی بے باکی کا نام ہے۔ اسے چھاتیوں کی گپھاؤں میں پڑ کر دن گزارنے کی ضرورت نہیں۔ دوستی انسانی اوصاف میں ایک قدرتی وصف ہے، بڑے خوبصورت اعضا والا۔ اسے اپاہج بنا کر بھک منگوں کی طرح چوراہے پر کھڑا کرنے کی ضرورت نہیں۔ انسان فخر سے چمکتے، اونچے سر والے جانور کا نام ہے۔ اس کے ماتھے کو کبھی مذہب اور کبھی مجبوری کے آستانہ پر جھکانے کی ضرورت نہیں.....

آج کا بیدار انسان اس سردی سے ٹھٹھر رہا ہے، جس میں خوابوں کی دھوپ نہیں پہنچ پاتی۔ سماجی اور سیاسی حقیقتوں کے ہاتھوں انسان ہر روز کانپتا اور ٹوٹتا ہے۔ سوچتی ہوں کوئی تخلیق، کوئی بھی تصنیف گویا دھوپ کی ایک کٹوری پینے یا پھر دھوپ کا ایک ٹکڑا

کوکھ میں ڈالنے والی بات ہے۔ اور کچھ نہ سہی، مگر زندگی کا جاڑا گزارنے کا ایک ذریعہ.....

موضوع کوئی بھی مخرب اخلاق نہیں ہوتا، اگر اُس کا اظہار، تجربہ کی امارت اور فکر کی ایمانداری کی پیداوار ہو اور ایک اسلوب اُسے نصیب ہوگیا ہو۔ کسی خوبصورت دل کا بیان کردہ کسی جسم کا لطیف ترین ذکر عریاں نہیں ہو سکتا۔ زندگی کی حقیقت سے کٹا ہوا ایک مہذب جملہ بھی مخرب اخلاق ہو سکتا ہے.....

جہاں اعتقاد ختم ہو جاتا ہے، وہیں سے فحاشی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ جہاں سے ذہنی نامردی شروع ہوتی ہے، مصنف وہیں ختم ہو جاتا ہے، اور جہاں مصنف ختم ہوتا ہے وہاں اُس کی تخلیق ادب کی حدود سے باہر آجاتی ہے۔

آج لکھنے والوں کی زیادہ تعداد اُن کرسیوں کی جانب تک رہی ہے، جن سے کبھی کبھی خیراتی تنخواہ مل جاتی ہے۔ لگتا ہے، اُن کا اپنی ذات میں کوئی اعتماد نہیں، صرف خیراتی تنخواہ میں ہے۔

مصنّف بہرحال مصنف ہے۔ گمنامی ہو یا شہرت، دونوں حالتوں میں وہ کسی کا ذلیل نہیں۔ دونوں حالتیں اُس کے جسم پر کے کپڑے کی طرح ہیں: نرم کپڑا یا کھردرا کپڑا۔ لیکن کوئی حالت اُس کے جسم کا گوشت نہیں بن سکتی۔

میری نظروں میں قلم وہ مصنف ہے جو روسی شاعر آندرے یوزنے سنسکی کی طرح یہ سوچ سکتا ہے کہ ہم گانے والی مچھلیاں ہیں، وہ، ہمیں جال لگا کر پکڑتے ہیں۔ ہمیں بھون، تل کر اپنی ضیافتوں کی آرائش بناتے ہیں۔ لیکن ہم مچھلی کے کانٹوں کی طرح ان کے گلوں میں ضرور اٹک جائیں گی۔

فن پہاڑی سفر سے بھی بڑھ کر ہے۔ پہاڑی سفر تو آخر کار کسی چوٹی پر ختم ہو سکتا ہے لیکن فن سفر میں کوئی چوٹی بھی آخری نہیں ہوتی۔

'ناگ منی' میں کبھی کبھی لکھنے والوں کی باہمی گفتگو شائع ہوتی ہے، اس کالم کا نام ہے 'گفتگو'۔ اس گفتگو میں کئی بار امرتا بھی شریک ہو جاتی ہے۔ اسی کالم کے کچھ اقتباسات:

ہم سبھی ــــ ہو گئے نہ ہوئے جنم کا درد سہہ کر بھی مرتے ہیں اور اجنما ہونے کی حسرت لے کر بھی۔ لگتا ہے یہ ایرنیساں کا نہیں 'انیسان' کا دور ہے اور ہم سیپوں میں پڑی بوندیں نہیں، انیسال کی بوندیں ہیں، موتی بننے کی حد تک پہنچ کر بھی اموتی ہیں۔ اسی لئے ہم موت کو ہمیشہ ایک سانس کے فاصلہ پر محسوس کرتے ہیں......

ــــ ناگ منی: اگست ۱۹۶۸ء

شو کمار: تمہیں کیسی آنکھیں پسند ہیں؟

امرتا: میں نے کازن تنزاکی کو دیکھا نہیں، لیکن جیسی اس کی آنکھیں تھیں......

شو کمار: اس کی آنکھوں کا کیا رنگ تھا؟

امرتا: وہ رنگ، جس سے اسے اپنے گریک عوام کی غلامی کا دور دکھائی دیتا تھا۔

ــــ ناگ منی: اکتوبر ۱۹۶۹ء

موہن سنگھ: چیکوسلوواکیہ کے بارے میں آپ نے بڑی جرأت سے روس کے اس اقدام کی نکتہ چینی کی ہے، اگرچہ آپ روس کی مجھ سے کم دوست نہیں۔

امرتا: دوست ہوں، بھی تو نکتہ چینی کا مجھے حق پہنچتا ہے۔ جہاں خواب مشترک ہوں، وہیں

خامیاں کھٹکتی ہیں۔ میں شتر اکیت کو اس سے کہیں وسیع معنوں میں لیتی ہوں۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک ڈسک اپنی جگہ سے ذرا ہل گئی ہے۔ بہت درد ہوتا ہے لیکن شکر ہے کہ میرے سلسلۂ خیال کی ریڑھ ثابت ہے۔ وہاں کوئی درد نہیں ہوتا۔

—— ناگ منی، دسمبر ۱۹۶۹ء

سنت سنگھ سیکھوں پنجابی کے نقاد ہیں۔ لیکن امرتا انہیں بلند پایہ نقاد تسلیم کرتی ہے۔ سیکھوں سے ہوئی گفتگو کا ایک اقتباس:

امرتا: سیکھوں صاحب! ابھی آپ کسی بات میں 'ہے' کہہ رہے تھے۔ ابھی ہے کو کتا، بنا دیا!؟

سیکھوں: آپ بہت بھولی ہیں۔ پل بھر ہی میں تو 'ہے' سے 'تھا' ہو جاتا ہے۔

امرتا: تو پھر آپ نے جو کبھی لکھا لکھایا ہے اسے بھی 'تھا' کہیں؟

سیکھوں: اس بارے میں مجھے اردو زبان کی پناہ لینا ہوگی اور وہ بھی اقبال کی ؎

اقبالؔ! عشق نے مرے سب بل دیئے نکال
مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

امرتا: آپ اپنے بل نکالنے چلے تھے، مگر آپ نے تو ادب میں بھی بل ڈال دیئے.....

بھائی بنّو سکھ دھرم میں ایک مسلمہ شخصیت کے مالک ہیں، یہاں تک کہ گورو گرنتھ صاحب کا ایک نسخہ بھائی بنّو کا نسخہ کہلاتا ہے۔ کہتے ہیں، گورو ارجن دیو نے گرنتھ کا ایک مخطوطہ بھائی بنو کو دیا تھا کہ وہ لاہور جا کر اس کو مجلد کرا لائیں۔ تب راستہ میں بھائی بنّو نے کئی خط لکھے گئے اور گرنتھ کی نقل کر کے مکمل نسخہ تیار کر لیا تھا۔ یہ گرنتھ سے بھائی بنو کی بے پناہ محبت کا پھل تھا۔ نویں پیڑھی کے سردار امولک سنگھ جب اسی بھائی بنو سے ملے تو تاریخ کے اس پہلو پر روشنی ڈالنے کے لئے امرتا نے ان سے ملاقات کی۔ ملاقات کے خاتمہ پر سردار امولک سنگھ بھائی بنو کے گوتر کے بارے بتلانے لگے امرتا نے کہا:

"ہاں میں جانتی ہوں کہ وہ کس گوتر کے تھے۔ اُن کا تعلق سنجیدہ قارئین کے گوتر سے تھا۔ آج کے دور میں ہم سب کو اسی گوتر سے منسلک ہونے کی ضرورت ہے ــــ مصنّفوں کو سنجیدہ مصنّفوں کے گوتر سے اور قارئین کو سنجیدہ قارئین کے گوتر سے۔"

ــــــ ناگ منی: فروری ۱۹۷۷ء

دلیپ ٹوانہ سے ایک گفتگو:

ٹوانہ: امرتا جی! اس بات کا جواب دیجئے کہ آپ لکھتی کیوں ہیں۔

امرتا: یہ جواب تو میں بہت پہلے دے چکی ہوں کہ ہماری تصانیف خود سے آگے خود تک پہنچنے کی ہماری ایک جدوجہد ہیں۔

ٹوانہ: تو پھر ان میں عوام تک پہنچنا کیوں ضروری ہے؟

امرتا: صحیح معنوں میں تو مصنف عوام تک کبھی نہیں پہنچتا، عوام ہی مصنف تک پہنچتے ہیں۔

ٹوانہ: چیخوف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُس نے عوام کو اُن کا اپنا آپ ڈھونڈ کر دیا۔ آپ اس کی وضاحت کیسے کریں گی؟

امرتا: میں جو ابھی کہہ چکی ہوں، یہ اُسی کی تائید ہے، مختلف الفاظ میں۔ چیخوف نے اپنی ذات کی تلاش کی اور اس تلاش سے لوگوں نے اپنے آپ کو پا لیا۔

ــــــ ناگ منی: اپریل ۱۹۷۷ء

"ناگ منی" کے قارئین امرتا سے کئی سوال کرتے ہیں، جن میں سے بعض باشعور سوالات کے وہ جواب بھی دیتی ہے۔ الفاظ سے کھیلنا اور اس طرح جواب میں "وِٹ" پیدا کرنا امرتا کی عادت نہیں۔ اُس کے جوابات قدروں سے وابستہ

ہوتے ہیں۔ "ناگ منی" کے اُس کالم کے بعض سوالات معہ جوابات یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۹۶۸ء میں جب چیکوسلوواکیہ کو اپنے دوست ملک روس کا مقابلہ کرنا پڑا تھا، تب امرتا نے کئی نظمیں لکھی تھیں اُن میں ایک کا عنوان تھا: "میرا پتہ"، اُس کی آخر سطر تھی: "جتھے وی سوتنتر روح دی جھلک پوے، سمجھنا، اوہ میرا گھر ہے"[1] اور یہ سطر پڑھ کر پنجاب کے ایک سنجیدہ قاری اور مصنف ملک راج کوہلی نے امرتا کو خط لکھا: "آپ کا پتہ نوٹ کر لیا گیا ہے۔" اس خط کی رسید دیتے ہوئے امرتا نے "ناگ منی" میں لکھا: "آپ کا خط مجھے اپنے نئے پتہ پر ملا۔ پہلا خط ہی آپ کا شکریہ! چاہتی ہوں کہ اوروں کے درمیان نہ سہی، کم از کم ادیبوں کے درمیان مجھ سے اسی پتہ پر خط و کتابت کا راستہ کھلے۔"

؟: ایک دوست سے بحث چل رہی ہے، لیکن کسی قطعی فیصلہ پر نہیں پہنچ پائے۔ آپ فیصلہ دیجئے کہ افضل انسان کون ہے، وہ جو حکم دینا جانتا ہے یا وہ جسے حکم کی تعمیل کرنا آتی ہے؟ (کرنیل سنگھ)

امرتا: افضل ترین انسان وہ ہے، جسے یہ دونوں باتیں نہیں آتیں۔

؟: فن کو چاہے کتنا بلند کیوں نہ تسلیم کر لیا جائے، لیکن آخر فن بھی ایک کاروبار ہے۔ ہے نہ؟

امرتا: جی ہاں، کاروبار ہی تو ہے۔ لیکن اس کاروبار میں انسان اور خدا ساجھی ہوتے ہیں۔ اس کا منافع خدا کی مخلوق اور انسان کی انسانیت میں تقسیم ہوتا ہے۔

---

[1] جہاں بھی آزاد روح کی جھلک ملے، سمجھ لینا، وہ میرا گھر ہے۔

؟ : خدا کرے، ہماری عمر فنکاروں کو لگ جائے! کیا ایسا نہیں ہو سکتا ؟ (اقبال)

امرتا: یوں کہیے کہ آپ کی عمر فنکاروں کے برابر ہو جائے۔ ذی شعور قارئین کے بغیر فنکار نری عمر لے کر کیا کریں گے ؟

؟ : آپ کے پانچ رمزیہ خواب پڑھے۔ دل میں کئی قسم کے سوالات پیدا ہوئے۔ ایک یہ کہ کیا کوئی پانچ شیروں یعنی انسانیت، غصہ، طمع، وابستگی اور غرور سے بچ سکتا ہے؟ اور کیا ان سے بچ کے رہنا سود مند ہے؟ کیا نفسانیت اور وابستگی زندگی کی دو عظیم ضرورتیں نہیں ہیں؟ کیا طمع زندگی کی معاشی ضروریات سے پیدا نہیں ہوتی ؟ (ملکیت سنگھ)

امرتا: اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ زندگی میں ان کا سب کا اپنا اپنا مقام ہے؟ انکار تو صرف ان کی غلامی سے کیا جا سکتا ہے۔ انسان ان سب کا استعمال کرے تو سُکھ ہے اور اگر یہ انسان کا استعمال کرنے لگ جائیں تو دکھ۔ جیسے زندگی برقرار رکھنے کے لئے روٹی کھانے کے معنی ہیں اور صرف روٹی کھانے کے لئے زندہ رہنا بے معنی ہے۔

؟ : ناگ منی، شدید طور پر کلاسیکی پرچہ بنتا جا رہا ہے۔ لگتا ہے، بہت جلد بند ہو جائے گا۔ گیارہ روپے ارسال ہیں: دس روپے سالانہ چندہ کے اور ایک روپیہ شگن کا۔ (راجندر سنگھ بیدی)

امرتا: بیدی صاحب! جس پرچہ کو آپ شگن کا ایک روپیہ بھیج دیں، وہ بند کیسے ہو سکتا ہے؟

؟ : دیدی! زندگی کا وہ کون سا دن ہوتا ہے، جب آپ اپنے آپ کو بہت خوش اور امیر محسوس کرتی ہیں ؟ (سُکھ چین بھنڈاری)

امرتا: جس دن کوئی اچھی چیز لکھی جائے یا اچھی چیز پڑھنے کو ملے۔ ہر روز لکھا تو نہیں جاتا، مگر پڑھنے کو تو ہر روز ملتا ہے اور یہ روز، ہر روز ہوتا ہے۔

؟ : ناگ منی کی شام، میں مصنف تو آ سکتے ہیں، لیکن کیا مجھ جیسے بھی آ سکتے ہیں جن

کے پاؤں یا ہتھیلیوں میں مصنف بننے کے لئے کھجلی ہوتی ہو؟ (سرجیت سنگھ آہلو والیہ)

امرتا: ضرور آسکتے ہیں۔ لیکن پاؤں کے تلووں میں کھجلی ہونا سفر پر جانے کی علامت ہے۔ اور ہتھیلیوں میں کھجلی ہونا روپیہ ملنے کی۔ میرے خیال میں مصنف بننے کی کھجلی ہو تو پیشانی میں ہونی چاہیئے۔

؟ : موجودہ حالات سے بے اعتنا مصنف ہیں یا قاری؟ (ہرچندر جیت)

امرتا: نہ اچھے مصنف، نہ اچھے قاری۔ ان کی تعداد بہت کم ہے۔

؟ : "موُتہاں نوں ملاحظے، تے مراں توں سلاماں" ــــ کیا یہ محاورہ "ناگ منی" پر بھی صادق آتا ہے؟ (ایک مصنف)

امرتا: "ناگ منی" نے اس محاورہ کو نئی قسمت بخشی ہے یعنی معیار کو "ملاحظے" اور دانشمندی کو "سلاماں"!

؟ : کیا ہر تصنیف سے قبل مصنف کی طبیعت بیقرار رہتی ہے؟

امرتا: رہتی ضرور ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر بیقراری تخلیقی ہو۔

؟ موجودہ حالات پر آپ کی نظم "ریون" بہت پسند آئی۔ لیکن ریون کے بارے میں جاننے کے لئے کئی کتابیں ٹٹولتا رہا، مجھے کہیں بھی اُس کا ذکر نہ ملا۔ (ہردیو)

امرتا: یہ سفید گردن اور نیلے پروں والا ایک پرندہ ہے۔ جو شمالی امریکہ کے اساطیر میں وہاں کے قبائل میں پوجا جاتا ہے۔ کہتے ہیں، اگر کوئی اسے مار، کاٹ کر سمندر میں بہادے تو یہ پھر سے ثابت ہو جاتا ہے اور آسمان میں پرواز کر جاتا ہے۔ اس کے بارے میں ایک لوک کہانی ہے کہ ایک بار کسی نے چاند کو کئی ٹکڑیوں اور کئی پوٹلیوں میں چھپالیا۔ ریون اُس کے گھر گیا اور اُس کے باغیچہ میں ایک جنگلی

لہ منہ پر لحاظ اور بڑے عہدہ والوں کو سلام

بیر کی شکل میں اُگ آیا۔ گھر کی ایک جوان لڑکی نے بیر چنے اور اس بیر کو بھی کھالیا۔ وہ اس کی کوکھ میں ایک بچہ بن کر پیدا ہوگیا۔ بڑا ہوا تو کھیلنے کے لئے اُس نے اپنی ماں سے چاند مانگا۔ ماں نے منت کر کے اپنے باپ سے وہ چھپایا ہوا چاند مانگا اور اُسے کھیلنے کے لئے دے دیا۔ اُس نے چاند کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ مگر اُس کے چاروں طرف دیواریں تھیں، کوئی دروازہ، کوئی کھڑکی نہ تھی۔ چنانچہ اُس نے چولہے کی چمنی سے چاند کو نکال کر آسمان کی طرف بھیج دیا۔ دنیا کی تاریک راتیں چاندنی راتوں میں تبدیل ہوگئیں۔ میں نے ریون کو جمہوریت کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے —— عوام کی آواز کی علامت۔

؟ : مجھے محسوس ہوتا ہے کہ عورت کے سارے اوصاف مثلاً محبت اور عاجزی گویا مصنوعی ہوتی ہیں۔ وہ مرد کو جو کچھ دیتی ہے، اُس سے کہیں زیادہ اُس کی قیمت وصول کر لیتی ہے۔ (جگ دیو سنگھ)

امرتا: مجبوری میں پیدا کئے ہوئے اوصاف مثلاً محبت، عاجزی وغیرہ مصنوعی ہوتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ عورت کی ایک اپنی شخصیت ہو۔ زیردست اور زبردست کے درمیان لین دین منصفانہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تو دو مساوی قوتوں کے درمیان ہی ہو سکتا ہے۔

؟ : آپ خود تو دنیا کی سیر کے لئے نکل گئیں اور ہمیں کہانیاں لکھنے پر لگا دیا ....

امرتا: آپ کو عادت ٹال رہی ہوں۔ اور پھر اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت بھی تو آپ کو، نئی نسل کو، اس کام پہ لگا کر جانا ہے۔

؟ : ادب میں فحاشی کیا ہوتی ہے؟

امرتا: جب ادب بے ادب ہو جائے۔

؟ : آدمی عشق میں پھنس جائے تو؟

امرتا: کیا دریا کا پانی پھنسا ہوتا ہے؟

؟ : کیا میں جان سکتا ہوں کہ "ناگ منی" کا حلقہ کون سا ہے؟ روتی نے آپ پر الزام لگایا ہے کہ آپ ایک مخصوص حلقہ سے وابستہ ہیں۔

امرتا: جی ہاں، میری زبان میں، یا دنیا کی کسی بھی زبان میں جو بھی اچھا لکھتا ہے، وہ میرا ہے اچھے مصنف اور اچھے انسان، یہی میرا حلقہ ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ یہ بات روتی کے معنوں میں نہیں ہے۔

؟ : امرتا جی! کبھی آپ نے لکھا تھا — "میری عمر سے بھی لمبی ہے میری وفا کی لکیر، اور شبدوں کی دولت کے بنا بھی وفا ہے امیر، یا موم بتی یہ پروانوں کی رات بھر جلتی رہی، لیکن آپ کی اُس حالت کے بارے میں کیا کہا جائے، جب آپ نے لکھا تھا۔ "ٹھر دا جائے عشق دا پنڈا، گیت دا جھگا کیکن سیوا ل۔ اُدھڑ گیا خیال تروپا۔ قلم موٹی دا نکا ٹٹا۔ ساری گل گواچ گئی اٹّے، کھوئی ہوئی بات سے کوئی کیسے جی سکتا ہے؟ (پریم سنگھ ایڈووکیٹ)

امرتا: پریم سنگھ جی! عشق ہموار، سپاٹ زمین کا نام نہیں ہے اور نہ وہ خالی از واقعات زندگی کا منظر ہے۔ جب دھرتی ہوتی ہے تو اُس کے اپنے ریگستان بھی ہوتے ہیں۔ جب کوہسار ہوتے ہیں تو اُن کے اپنے جوالا مکھی بھی ہوتے ہیں۔ جب دریا ہوتا ہے تو اُس کے اپنے بھنور بھی ہوتے ہیں۔ جب آسمان ہوتا ہے تو اُس کے اپنے بادل اور بجلیاں بھی ہوتی ہیں۔ خدا سے محبت کرنے کی صورت میں، خدا کے عاشق کو اپنے عشق کی بنا پر خدا سے بغاوت کرنے اور اُس سے منکر ہو جانے کا

لہ عشق کا رشتہ ٹھٹھر رہا ہے۔ گیت کا کرتہ کیسے سیا جائے؟ خیالوں کا تار اُدھڑ گیا۔ قلم کی موزن کا ناکا ٹوٹ گیا ہے اور ساری بات کھو گئی ہے۔

بھی حق پہنچتا ہے یہ اسی طرح ہے، جیسے کوئی کھلے آکاش تلے اپنے سر پہ چھت ڈال لیتا ہے۔ وہ آکاش کی ہستی سے انکار تو نہیں کرتا۔

---

۵ فروری ۱۹۷۷ء کی شام کو "رسیدی ٹکٹ" پڑھ کر کملیشور نے دلی کے ہوٹل براڈوے سے ٹیلی فون کیا: "سارا دن رسیدی ٹکٹ، پڑھتا رہا پھر آپ کے نام ایک خط لکھا۔ اب وہ خط آپ تک کیسے پہنچاؤں؟"

امرتا نے جواب دیا: "اپنے خط کے ڈاکیے بن جائیے نہ" اُس شام کملیشور آئے اور خط پڑھ کر سنایا۔ وہ خط کملیشور کے تخیل سے اس قدر بھیگا ہوا تھا کہ سنتے ہی امرتا کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

ادبی حسد جیسی بات امرتاؔ کی سمجھ سے پرے ہے۔ اُس دن کملیشور نے اپنے اندرون سے ایک عظیم مصنف کا ہاتھ، دوستی کا ہاتھ پڑھایا تھا۔ اُس رات امرتا ایک نشہ میں سرمست رہی۔ بار بار کہتی: "دنیا میں جہاں بھی نیکی ہے۔ جہاں بھی حسن ہے، میرا ہے۔ میں نے جزیرہ کریٹ نہیں دیکھا لیکن کازنتزاکس میرا ہے۔ کملیشور جب 'کتنے اچھے دن'، جیسا افسانہ لکھتا ہے، وہ مجھے میرا افسانہ نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر لکشمی نرائن لال جب 'یکش پرشن'، لکھتا ہے، نرمل ورما جب 'ڈیڑھ انچ اُوپر'، لکھتا ہے، کرشنا سوبتی جب 'سورج مکھی اندھیرے کے'، لکھتی ہے، تو..... تو.....

اُس رات امرتا سچ مچ ایک دھرتی سی نظر آ رہی تھی، جس کے بازوؤں میں پربت سمائے ہوئے ہوں اور سمندر بھی۔

"ناگ منی" کے ایک قاری ہردیوؔ نے ایک بار امرتا کے افسانوں اور ناولوں

کی بعض سطور کا انتخاب کر کے ارسال کیا تھا جو 'ناگ منی' میں 'ایک ڈائری' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ ہردیو کے الفاظ میں ــ "امرتا جی! آپ کی تصانیف سے کئی سطوریں اپنی ڈائری میں درج کی ہیں۔ یہ کئی بار میرے دل کا سہارا بن جاتی ہیں ان میں زندگی کو ایک فلسفہ دینے کی قوت ہے۔ ان میں دکھی انسان کا دکھ ہے۔ اگر کہوں کہ ان میں ہماری زبان کی کہاوتیں بننے کی قوت بھی ہے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔" ہردیو کی منتخبہ سطور کے ساتھ کچھ اپنا انتخاب یہاں پیش کر رہا ہوں:

ہماری منڈیوں میں گیہوں بکتا ہے، جوار بھی اور عورت بھی فروخت ہوتی ہے....

معاشی غلامی سے جب عورت غلام بن جاتی ہے تو وہی غلامی ذہنی غلامی بن جاتی ہے۔ ذہنی غلامی جب ناسور بن جاتی ہے تو لوگ ناسور کے جسم پر "پاکیزگی" کی پوشاک پہنا دیتے ہیں۔ یہ پاکیزگی جو خود مختاری سے نہیں، بلکہ مجبوری سے جنم لیتی ہے، سماج کے خزانہ کا قیمتی سکّہ بن جاتی ہے اور سماج ہر عورت کو اس سکّے سے تولتا ہے.....

(افسانہ 'آخری خط' سے)

عورت کا گناہ ایک پھول جیسا ہوتا ہے جو پانی میں ڈوبتا نہیں، بلکہ تیرتا ہوا مُنہ سے بولتا ہے۔ مرد کا کیا ہے؟ اُس کے گناہ تو پتھروں کی طرح پانی میں ڈوب جاتے ہیں.....

(افسانہ 'نہ جانے کون رنگ دے' سے)

تہذیب کا زمانہ تب آئے گا، جب عورت کی رضامندی کے بغیر کوئی اُس کے جسم کو ہاتھ تک نہ لگا سکے گا۔ (افسانہ 'گلیانہ کا خط' سے)

مرد مر جائے تو چاہے عورت کے سبھی اعضا زندہ رہیں، لیکن اُس کی کوکھ ضرور مر جاتی ہے

(افسانہ 'تیرلی عورت' سے)

اس دنیا کے سُنار سونے میں کھوٹ ڈالتے ہیں۔ دُنیا اُن سے کچھ نہیں کہتی۔ لیکن اس دنیا کے عاشق سونے میں سونا ڈالتے ہیں تو دنیا اُن کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔

(افسانہ 'مٹی کی ذات' سے)

جب کوئی جسم سے ماورا ہو جاتا ہے تو جسم دشمن نہیں رہتا، دوست بن جاتا ہے۔ (کہانی 'وہ عورت' سے)

ہر مذہب کے لبوں پر انسان کا خون لگا ہے (افسانہ 'پردیسی' سے)

مٹی کی ذات کسی نے نہ پوچھی ...... ایک بنجر زمین کا ٹکڑا گھوڑی پر چڑھ کر ایک چکنی مٹی سے بیاہ رچانے آگیا ...... (افسانہ 'مٹی کی ذات' سے)

شادی کے پیشہ میں کسی کی ترقی نہیں ہوتی۔ بیویاں ساری زندگی بیویاں ہی رہتی ہیں۔ خاوند عمر بھر خاوند ہی رہتے ہیں۔ ترقی ہو سکتی ہے، لیکن ہوتے دیکھی نہیں یہی ترقی کہ آج جو خاوند ہے وہ کل محبوب بن جائے اور پھر برسوں خدا بن جائے ..... وہ رشتہ جسے صرف ایک رسم کے سہارے کھڑا کیا گیا تھا، وقت گزرنے پر دل کے سہارے کھڑا ہو جائے ..... روح کے سہارے ...... (افسانہ 'ملکہ' سے)

زندگی! یہاں فنکار تمہاری باتیں کہہ رہے ہیں، لیکن تمہارا چہرہ نہیں دیکھ پاتے۔

اور جب منصور نے چہرہ دیکھ لیا، اُسے سزائے موت دی جاتی ہے۔

معنوں کا کوئی جھروکہ نہیں ہوتا۔ درختوں کے پتوں کی طرح وہ چپ چاپ لگتے ہیں اور پھر چپ چاپ جھڑ جاتے ہیں (افسانہ 'دو کھڑکیاں' سے)

رونا نو زائیدہ بچہ کے گلے سے ہی نہیں نکلتا، نازائیدہ بچہ کے گلے سے بھی رونے کی آواز آتی ہے (افسانہ 'نہ خانہ' سے)

آدمی کو سماج کی ضرورت ہے، لیکن سماج کو آدمی کی نہیں (افسانہ 'پانچ برس لمبی سڑک نمبر ۳' سے)

یہاں اگر کسی کو چلنا ہوتا ہے تو کسی دوسرے سے پاؤں لے کر چلتا ہے..... پہلا دوسرے سے، دوسرا تیسرے سے، تیسرا چوتھے سے ...... پاؤں ادھار لے کر، اپاہج کی طرح .. .. (افسانہ 'پانچ برس لمبی سڑک نمبر ۴' سے)

فکر کی مکھی ڈنک مارتی ہے، لیکن شہد بھی تو جمع کرتی ہے... سڑکیں وہیں کی وہیں رہتی ہیں، لیکن راہگیر گزر جاتے ہیں۔ راہگیر بھی صرف چلتے ہی ہیں، کہیں پہنچ نہیں پاتے۔

دھرتی کی طرح دل کے سفر کی سڑک بھی گول ہوتی ہے۔ خود سے چلتی ہے۔ خود تک پہنچتی ہے۔

چمٹے سے کوئلہ تو پکڑا جا سکتا ہے، لیکن شعلہ نہیں پکڑا جا سکتا۔ شعلہ تو صرف شعلے سے پکڑا جاتا ہے (افسانہ 'پانچ برس لمبی سڑک نمبر ۵' سے)

بہاؤ کی آزادی بہتے پانی کو ہوتی ہے، رکے پانی کو نہیں۔
ایک آزاد منش اور دانشمند آدمی کو زندگی کی رفاقت نہ تو کسی دیوی سے مل سکتی ہے۔ نہ کسی طوائف سے اور نہ کسی کنیز سے ......

(کتاب 'عورت: ایک نقطۂ نگاہ سے)

عورت کی کوکھ کبھی بانجھ نہیں ہوتی۔ اگر کوکھ بانجھ ہو جائے تو زندگی کے یہ حادثے کس کے ساتھ کھیلیں گے؟ (ناول 'بند دروازہ' سے)

عورت کی تقدیر کو ایشور رائے ہاتھ سے لکھتا ہے۔ جو بھی لکیر سیدھی پڑ جائے۔ وہی غنیمت ہے (ناول 'پکّی حویلی' سے)

جب کوئی انسان اپنے اندر سے قوت حاصل کرتا ہے، تو اُس سے اس طرح پیار کرتا ہے، جیسے کوئی اپنی محبوبہ سے کرتا ہے۔ لیکن اندر کے بجائے جب قوت دنیا سے ملتی ہے۔ تو وہ اُس سے یوں محبت کرتا ہے، جیسے کوئی طوائف سے کرتا ہے۔

کوئی بھی رشتہ بدن پر پہنے ہوئے کپڑے کی مانند ہوتا ہے: اُسے کسی وقت بھی بدن سے اتارا جاسکتا ہے۔ لیکن کئی رشتے شریانوں میں بہنے والے لہو کی طرح بھی ہوتے ہیں، جن کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔
اور کئی رشتے بدن پہ ہونے والی کھُجلی کی طرح بھی ہوتے ہیں ......
(ناول 'دھرتی ساگر اور سیپیاں' سے)

عورت ذات کا سفر نامہ کوکھ کی تاریکی سے قبر کے اندھیرے تک کا ہوتا ہے۔

(ناول دِلّی کی گلیاں سے)

پرائی اینٹوں سے گھر نہیں بستے۔ (ناول 'پنجر' سے)

ضروری نہیں، اتارنے والی شے لوہے ہی کی ہو۔ سونے کی زنجیر بھی ہو سکتی ہے۔
(ناول 'اتحاد اور امیرئل' سے)

ایشور نہ جانے کیا چیز ہے۔ لیکن جب ہم مشکلوں سے گزر رہے ہوں، اُس کا نام لبوں پہ آ ہی جاتا ہے۔ نہ جانے کون اُن لبوں کی ہمت بن کر۔۔۔۔ اپنی ساری آواز روک لیتا ہے۔

کچھ جیتے جاگتے خواب ہوتے ہیں جو دیواروں پر لگے ہوتے ہیں: کیل ٹھونک کر لگائے ہوئے۔ ہلتے ہیں، لیکن دیواروں سے اترتے نہیں۔

لباس بھی عجیب شے ہے، جسم پہ پہنا ہو تو تہذیب بن جاتا ہے۔ لیکن رُوح پہ پہنا ہو تو دیگہ مٹی ہوتا ہے۔

وقت کے پاس پہننے کے صرف تین جوڑے ہیں ــــ ماضی، حال اور مستقبل۔ وقت ہمیشہ وہی رہتا ہے، صرف کبھی کبھی کپڑے بدل لیتا ہے۔

کچھ لوگ بہک جاتے ہیں، کچھ ڈھیٹ بن جاتے ہیں۔ بہک جانے والے پوجا پاٹھ کرنے لگتے ہیں، ٹونا ٹوٹکا کرنے لگتے ہیں یا پھر جیوتشیوں کو ہاتھ دکھاتے پھرتے ہیں۔۔۔۔ جو ڈھیٹ بن جاتے ہیں، وہ بڑے اطمینان سے وِسکی کا گلاس ہاتھ میں لیتے ہیں اور ریڈیو لگا کر جنگ کی خبریں اس انداز سے سنتے ہیں، جیسے فٹ بال یا کرکٹ میچ کی خبریں سن رہے ہوں ــــ کتنے ہوائی جہاز گرے، کتنی رنز ہوئیں۔ فوجیں کہاں کہاں پہنچیں

کس کپتان نے گول کیا۔

ناموں میں کیا دھرا ہے؟ وہ تو پنڈتوں کے پتروں میں بھی بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اخباروں میں بھی اور تاریخ کے صفحات میں بھی......

سڑتے ہوئے پانی میں بلبلے اُٹھتے ہیں۔ لغات کی کتابوں میں اُن کا نام امید ہے...

کسی انسان کو اگر اپنی صحیح سوانح حیات تحریر کرنا ہو تو اُسے چاہیئے کہ وہ کورے کاغذوں پر اپنا لہو لگا دے۔ لہو لگے صفحات پر یہ بات صاف طور سے پڑھی جا سکے گی کہ یہ لہو روٹی کی فکر میں کس طرح سوکھتا رہا تھا۔ ہزاروں جنتاؤں میں یہ لہو کس طرح سسکتا رہا تھا۔ اور میدان جنگ میں کیسے بہتا، بکھرتا رہا تھا..... یا شریانوں میں بے فائدہ ہی دوڑتا رہا تھا.... (ناول ' جلاوطن ' سے)

ساری دنیا کپڑوں میں کٹی ہے، بھیسوں میں بٹی ہے۔ دھرتی کے ٹکڑے بھی بھیسوں ہی سے پہچانے جاتے ہیں: اپنے اپنے جھنڈوں سے۔ اُن کی حفاظت بھی انسان نہیں کرتے، وردیاں کرتی ہیں۔ بھلا کسی اصلی انسان کسی اصلی انسان کو مار سکتا ہے؟ یہ تو ساری وردیوں، پوشاکوں اور جھنڈوں کی لڑائی ہے۔

گیان کو دھارن کرنا شو کے گنگا کو سر میں دھارن کرنے والی بات ہے۔

ہم لوگ ریت کو بُہار رہے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ کوئی ہل، سہاگہ لے کر ریت بہارتا ہے۔ کوئی باٹ اور ترازو لے کر تو کوئی قلم اور کاغذ سے۔ (ناول ' جاتری ' سے)

آج اور کل کے درمیان غریبی کا وہ طویل فاصلہ ہوتا ہے جو بسا اوقات ایک جنم میں طے نہیں ہو سکتا۔

سمجھ کی حدود میں آ کر بھی کئی باتیں سمجھ سے پرے رہتی ہیں۔

گھر بدلے جا سکتے ہیں۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ جہاں بھی جائیں، وہیں گھروں کے

کونے ہوتے ہیں، کونوں کی تاریکی ہوتی ہے اور تاریکی میں لٹکتے سوال.....

کئی باتیں ایسی ہوتی ہیں، جنہیں الفاظ کی سزا نہ دی جانی چاہیئے۔

غور سے دیکھیں تو یہ دھرتی مجبوریوں کی ایک طویل تواریخ ہے۔

بھرے دربار میں دروپدی نے دریودھن سے پوچھا تھا کہ اگر یدھشٹر خود کو جوئے میں ہار چکے ہیں تو انہیں مجھ کو داؤ پہ لگانے کا کیا حق تھا؟ ہزاروں سال بیت گئے، مگر یہ سوال آج بھی خلا میں لٹک رہا ہے۔

اعتراض کا تعلق قانون سے ہے اور تذبذب کا دل سے۔

زمانے کا پھیر ہے۔ آج محبت کو کوئی ہون کنڈ نہیں کہتا..... آج کے رکھششوں کو کوئی راکھشس نہیں کہتا..... آج کی نیکی کو کوئی بردان نہیں کہتا..... آج کی برائی کو کوئی بددعا نہیں کہتا.....

خاموشی کا عیب بہت بڑا اور وسیع ہے: آدمی کے بستر سے دنیا کے شاہی تخت تک.....

کئی سوال صدیوں سے خلا میں معلّق ہیں، مگر انسان صدیوں سے خاموش ہے۔

ان غلط راہوں پر چلنے کے لئے ہمت کی ضرورت نہیں، نہ چلنے کے لئے ہمت درکار ہے۔

اگر بھگوان پتھر سے تراشا جا سکتا ہے تو انسان کیوں نہیں تراشا جا سکتا — بلکہ اُسے پتھر سے تراشنا زیادہ صحیح ہوگا۔

زبان تو حکومت کے پاس ہوتی ہے۔ انسان تو ہمیشہ سے خاموش ہے۔

(ناول 'یہ سچ ہے' سے)

نچلے متوسط طبقہ کے گھروں میں ایک مخصوص قسم کی بُو ہوتی ہے۔ چارپائیوں کے نیچے

ٹرنکوں اور ٹین کے ڈبوں کی طرح ہمیشہ چھُپ کر بیٹھی ہوتی بھی اور کیلوں پر لٹکتے مٹ میلے کپڑوں اور رام، کرشن یا ہنومان کے کیلنڈروں کی طرح دیواروں پر قبضہ جما کر بے خوف کھڑی بھی۔

ایک راحت صرف یک طرفہ خیال کی غلامی کی راحت ہوتی ہے، جیسے مذہب، دولت، بنے بنائے کاٹے تراشے قانون کے سہارے۔ اُسے دل کے درد کا بر دان کبھی نہیں ملتا۔ غلامی کی راحت مل جاتی ہے، لیکن آزادی کا درد نہیں ملتا۔

ہر لڑکی شادی کی پہلی شب کو جس کمرہ میں داخل ہوتی ہے، اجنبی کمرہ کا مالک اُس کے خیر مقدم کے لئے وہاں نہیں ہوتا۔۔۔۔ اور وہ لڑکی ایک اجنبی کمرہ میں کسی خواہ مخواہ گھس آنے والے کی طرح وارد ہو جاتی ہے۔

جب جسم میں آگ جلتی ہے، تب صرف آگ کے جلنے کی بو آتی ہے اور کسی شے کی نہیں اور شاید اُس میں جل کر سب کچھ راکھ ہو جاتا ہے

کچھ خیال صرف ایک بو کی طرح ہوتے ہیں۔ انہیں ہاتھ میں لے کر کسی کو دکھایا نہیں جا سکتا۔۔۔۔ وہ ہر وقت نہیں آتے۔ بارش کا قطرہ گرتے ہی خود بخود آ جاتے ہیں اور گھر کے کونہ میں سمٹ کر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر دھوپ نکلنے پر نہ جانے کہاں چلے جاتے ہیں۔

کچھ پھول صرف کسی قبر پر چڑھنے کے لئے اُگتے ہیں۔۔۔۔ شاید میں بھی۔۔۔۔

ہونٹ کی آگ ہاتھوں میں ایک رشتہ تو تھما سکتی ہے، مگر اُس کی لپٹ دل کے گوشوں تک کبھی پہنچ نہیں سکتی۔ وہ گوشے ہر رشتہ کی حدود سے پرے ہی رہتے ہیں۔

ایسی خبر بھی تو سچی ہو سکتی ہے، جسے کبھی کسی اخبار میں چھپنے کا موقع ہی نہ ملا ہو۔

انسانی دل کا مطالعہ اخباروں کی طرح عام آنکھوں سے نہیں کیا جا سکتا۔

(ناول؛ ایک خالی جگہ، سے

کتاب کے خاتمہ پہ امرتا کی خود سے کی ہوئی ملاقات، 'میں اور میں'، کا آخری حصّہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں اُس کی شخصیت کا ایک خاص پہلو، اُس کے من کی فقیری، بہت واضح صورت میں ہمارے سامنے آجاتا ہے:

ایک دکھ یہ ہے کہ میں شاعر بن کر رہ گئی —— ایک شاعر، ایک ادیب۔ ہزاری پرشاد دویدی کے ایک ناول میں ایک راجکماری کسی رِشی کے بیٹے سے پیار کرتی ہے وہ اس پیار کو اپنے سینے میں یوں چھپا لیتی ہے کہ وہاں تک کسی کی نظر ہی نہیں پہنچ پاتیں۔ لیکن ایک بار اُس کی سہیلیوں جیسی ایک بہن اُس سے ملنے آتی ہے۔ اُسے اس پیار کی بو مل جاتی ہے۔ تب راجکماری اُس سے کہتی ہے:

"اُرُو! اروزِ اوّل سے تیتری پھولوں کے گرد گھومتی ہے، بیل کسی درخت کے گلے ملتی ہے، رات کو کھلنے والا کنول چاندنی کے لئے بیقرار رہتا ہے اور بجلی بادلوں سے کھیلتی ہے۔"

لیکن یہ سب باتیں بے ساختہ ہی ہوتی تھیں، کوئی اِن پر انگلی نہ اُٹھاتا تھا۔ نہ کوئی ان کے راز کو پالینے کا دعویٰ کرتا تھا۔ اتنے میں ایک دن کوئی شاعر آگیا۔ اُس نے چیخ کر کہا:

"میں اس خاموشی کی زبان کو خوب سمجھتا ہوں۔ سنو! دنیا والو! میں نگاہوں کی زبان جانتا ہوں۔ بازوؤں کی بولی بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ چھپا ڈھکا ہے وہ بھی مجھ سے پوشیدہ نہیں۔"

اور اُسی دن سے فطرت کا سارا پھیلاؤ غلط ملط ہو گیا ..... یہ ایک عظیم حقیقت ہے۔ واقعی کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں، جنہیں خاموشی کی زبان مل جانی چاہیئے ..... لیکن ہم لوگ، ہم شاعر اور ادیب اُن کو اُس زبان سے نکال کر باہر شور میں لے آتے ہیں۔ جانتے ہو، اُس راجکماری نے پھر اپنی اُس سہیلی سے کیا کہا تھا؟ کہا تھا:

"اُرُو! تم نے جو سمجھا ہے، اُسے چپ چاپ اپنے سینہ میں رکھ لو۔ تم شاعر سے

عظیم تر ہو جاؤ۔"

میرا دکھ یہی ہے کہ میں شاعر سے عظیم تر نہ ہو سکی۔ قلب کے اندرون میں جو کچھ بھی زندہ کیا، کاغذ کے سپرد کر دیا۔ اتنا ہی نہیں، تخلیق کے لمحوں کا احساس بھی تحریر کر دیا.... مصنف کے طور پر رسیدی ٹکٹ، میری دریافت ہے۔ لیکن میں فقط مصنف ہی بن پائی، مصنف سے عظیم تر نہ ہو سکی...... (کتاب "جنگ جاری ہے" سے).

ہماری مطبوعات

ناقابلِ فراموش	دیوان سنگھ مفتوں
کارِ جہاں دراز ہے	قرۃ العین حیدر
آشفتہ بیانی میری	رشید احمد صدیقی
رسیدی ٹکٹ	امرتا پریتم
پیغمبرانِ سخن	سردار جعفری
وے صورتیں الٰہی	مالک رام
ساحر شخص و شاعر	ناز صدیقی
آگ کا دریا	قرۃ العین حیدر
سیتا ہرن	″
ماں کی کھیتی	″
آدمی کا مقدر	″
ڈنگو	″
آلپس کے گیت	″
تلاش	″
کٹاری	سعادت حسن منٹو
ایک گدھے کی سرگذشت	کرشن چندر
الٹا درخت	″
دادر پل کے بچے	″
میری یادوں کے چنار	″
رات چور اور چاند	بلونت سنگھ
چک پیراں کا جسا	″
ناگ منی	امرتا پریتم
یہ سچ ہے	″
پنجر	″
انچاس دن	″
رنگ کا پتہ	″
ایک تھی انیتا	″

ڈاکٹر دیو	امرتا پریتم
بلاوا	″
دو ہاتھ	عصمت چغتائی
بدن کی خوشبو	″
افسانے ڈرامے	″
ایک لڑکی ایک جام	امرتا پریتم
پھول کی تنہائی	کرشن چندر
محبت کی رات	″
نئے غلام	″
بلونت سنگھ کے افسانے	بلونت سنگھ
پطرس کے مضامین	پطرس بخاری
پطرس کے خطوط	″
تنقیدی مضامین	″
اس نے کہا	خلیل جبران
خدا اور دیوتا	″
زرد پتے	″
جوانی اور محبت	″
مجرم	″
پاگل	″
ہاتھ ہمارے قلم ہوئے	راجندر سنگھ بیدی
کندن	″
بیدی کے افسانے	″
پانچ برس لمبی سڑک	امرتا پریتم
مضامین رشید	رشید احمد صد
خنداں	″
مضامین کرشن چندر	کرشن چندر